تذکیاتِ جمعہ

خزائنِ علمیہ، براہینِ قاطعہ اور خطباتِ نادرہ کا ایک حسین مجموعہ،
علماء، خطباء اور عوام سبھی کے لئے یکساں مفید۔

- سورۂ جمعہ کے دوسرے رکوع کی تفسیر
- نمازِ جمعہ اور خطبے سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ
- جمعہ کے عربی خطبوں کا خلاصہ
- خطبہ میں خلفاء راشدین کا ذکر کیوں؟
- عدل کے تقاضے
- احسان کسے کہتے ہیں؟
- عزیز و اقارب کے حقوق ادا کریں
- فواحش اور منکرات سے بچیں
- علم کے بعد عمل ضروری ہے
- عید کا پیغام
- جمعہ اور عیدین کے آداب و احکام
- جمعہ اور عیدین کے عربی خطبات

افادات
مفسرِ قرآن فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی شاہ محمد نوال الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث دارالعلوم شکاگو و بانی رحمتِ عالم فاؤنڈیشن

تذکیراتِ جمعہ

خزائنِ علمیہ، براہینِ قاطعہ اور خطباتِ نادرہ کا ایک حسین مجموعہ،
علماء، خطباء اور عوام سبھی کے لئے یکساں مفید۔

- توحیدِ الٰہی اور اس کی اقسام
- عقیدۂ رسالت اور اس کے تقاضے
- عقیدۂ ختمِ نبوت اور دجاجلۂ اُمت
- عقیدۂ ختم نبوت آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ
- ختم نبوت کے تقاضے اور چند باطل فرقوں کا تعارف
- اسلام کی جامعیت
- اسلام پر ثابت قدم رہیں
- عظمتِ الٰہی اور اس کا استحضار
- اختیاری اور غیر اختیاری حالات میں کیسے رہیں؟
- آخرت کی تیاری کریں
- ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

جلد دوم

افادات

مفسرِ قرآن فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی شاہ محمد نوال الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث دار العلوم شگاگو و بانی رحمت عالم فاؤنڈیشن

RAHMAT-E-ALAM FOUNDATION

تفصیلاتِ کتاب

جملہ حقوقِ طباعت بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	تذکیراتِ جمعہ جلد دوم
افادات	:	مفسرِ قرآن فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی شاہ محمد نوال الرحمن صاحب دامت برکاتہم
زیرِ اہتمام	:	رحمتِ عالم فاؤنڈیشن (شکاگو، امریکہ)
ناشر	:	شریعہ بورڈ آف انڈیا (حیدرآباد)
صفحات	:	۲۳۵
سن طباعت	:	رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ مطابق مئی ۲۰۱۹ء
قیمت	:	۱۸۰

ملنے کے پتے:

آستانۂ صوفی، یوسف نگر، ٹپہ چبوترہ، حیدرآباد، انڈیا۔ 9989478786

شریعہ بورڈ آف انڈیا، رضوان کالونی، شاستری پورم، حیدرآباد۔ 7032100200

مدرسہ احیاء العلوم ٹپہ چبوترہ یوسف نگر، حیدرآباد۔ 8885581031

مکتبہ کلیمیہ نامپلی، یوسفین چوراہا، حیدرآباد۔

ہندوستان پیپر ایمپوریم مچھلی کمان چارمینار، حیدرآباد۔

Rahmat-e-Alam Foundation
7045 N Western Avenue, Chicago, IL 60645
Phone No: (773)764-8274

ISBN 978-0-991034-44-4

فہرست عناوین	صفحہ نمبر
❊ عرضِ مرتب	۱۹
توحیدِ الٰہی اور اس کی اقسام	
❊ تزکیہ کا مطلب	۲۲
❊ علم، عقل اور تزکیہ کا محل	۲۳
❊ عوام الناس کی ایک جہالت	۲۴
❊ اللہ کے ہاں باطن بھی ظاہر ہے	۲۵
❊ آنکھوں کی چوری اور دل کے راز کو بھی وہ جانتا ہے	۲۵
❊ ہماری نظر غیر اللہ پر کیوں؟	۲۵
❊ شرک کی کبھی معافی نہیں ہوگی	۲۶
❊ ایک مرتبہ کلمۂ طیبہ کہنے کی اہمیت	۲۷
❊ توحید صرف واحد گفتن کا نہیں بلکہ واحد دیدن اور واحد دانستن کا نام ہے	۲۸
❊ توحید کی دو بنیادی قسمیں	۲۹
❊ توحید کی تیسری قسم	۲۹
❊ توحیدِ اعتقادی کے چار درجات	۲۹
❊ توحیدِ ذاتی	۲۹
❊ توحیدِ صفاتی	۳۱
❊ توحید افعالی	۳۲
❊ مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ	۳۲

❊ خلق اور کسب میں فرق	۳۳
❊ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کے کلماتِ تشکر	۳۴
❊ مٹی آپ نے نہیں ہم نے پھینکی تھی	۳۴
❊ حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعا	۳۵
❊ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو توحیدِ افعالی کے حصول کی مبارک بادی	۳۵
❊ توحید آثاری	۳۶
❊ عقیدۂ تقدیر بھی توحید افعالی سکھاتا ہے	۳۶
❊ آپ علیہ السلام کی حضرت حارثہ کے لئے عارف ہونے کی گواہی	۳۶
❊ اللہ کو دل میں لانے کے لئے غیر اللہ کو دل سے نکالنا پڑے گا	۳۷
❊ قربِ الٰہی کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں	۳۸
❊ اللہ کا استحضار پیدا کریں	۳۹
❊ اللہ کے استحضار کا ایک واقعہ	۴۰
❊ استحضارِ الٰہ کیلئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے	۴۱
❊ توحید بھی اور شرک بھی	۴۲
عقیدۂ رسالت اور اس کے تقاضے	
❊ رسالت پر ایمان جزءِ ایمان ہے	۴۵
❊ عقیدۂ رسالت میں سارے رسول داخل ہیں	۴۶
❊ انبیاء پر ایمان کی دو صورتیں	۴۷
❊ انبیاء اور رسل کی تعداد	۴۸

❊ عقائد کے ثبوت کے لئے روایات کا معیار	۴۸
❊ کیا بدھا سے مراد حضرت ذوالکفل ہیں؟	۴۹
❊ سابقہ شریعتوں کا نسخ حضور پر ایمان بالرسالت کا جزء ہے	۵۰
❊ سابقہ شریعتیں منسوخ کیوں؟	۵۱
❊ آپ کی افضلیت کے چند دلائل	۵۱
❊ عقیدۂ افضلیتِ انبیاء	۵۳
❊ آپ ﷺ کی افضلیت کے اظہار میں بھی اعتدال ضروری ہے	۵۵
❊ افضلیتِ انبیاء سے متعلق ایک صحابی اور یہودی کا واقعہ	۵۶
❊ لاتفضلونی علی یونس بن متی کی وضاحت	۵۷
❊ شعراء کا غلو اور کچھ بے اعتدالیاں	۵۷
❊ معجزات کے مابین تقابل غلط ہے	۵۸
❊ بعثتِ عامہ کا عقیدہ	۶۱
❊ بعثت کی عمومیت زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے ہے	۶۱
❊ آپ جنات کے بھی نبی ہیں	۶۳
❊ عقیدۂ ختم نبوت بھی رسالت کا جزء ہے:	۶۴
عقیدۂ ختم نبوت اور دجاجلۂ امت	
❊ ختم نبوت کے منکرین کی پیشین گوئی	۶۷
❊ جھوٹے مدعیانِ نبوت اور حضور ﷺ کا خواب	۶۷
❊ حضرت ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ خولانی کی کرامت	۶۸

❊ مسیلمہ کذاب کا قتل	۷۰
❊ عقیدۂ ختم نبوت پر شہداءِ صحابہ کی تعداد	۷۰
❊ جمع قرآن کا سبب	۷۱
❊ صحابہ کا سب سے پہلا اجماع ختم نبوت کے منکر کے کفر اور قتل پر ہوا	۷۱
❊ قادیانی فرقہ کی ابتداء	۷۲
❊ مسلمان ان کے بہکاوے میں کیسے آتے ہیں؟	۷۲
❊ قادیانیوں کی تلبیس اور اس کا جواب	۷۳
❊ آپ کی رحمت تا قیامت	۷۳
❊ قادیانیوں کا دوسرا دھوکہ اور اس کا جواب	۷۵
❊ آپ ﷺ کی ایک خصوصیت	۷۷
❊ امتِ محمدیہ کی خصوصیت	۷۷
❊ بگاڑ کی اصلاح علماء اور مجددین کی ذریعہ	۷۸
❊ مرزا کے مختلف دعوے	۷۹
❊ قادیانیوں کے تین گروہ	۸۱
❊ جھوٹے مدعی نبوت سے مطالبۂ دلیل بھی مستلزمِ کفر ہے	۸۱
❊ کذاب مرزا کی موت	۸۲
❊ دنیا دھوکہ کی جگہ ہے	۸۲
❊ قادیانیوں کا ایک اور دھوکہ	۸۳
❊ تحفظ کا راستہ	۸۵

عقیدۂ ختم نبوت آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ

❊ کلمہ کے اقرار کے باوجود کفر کا حکم کیوں؟	۸۷
❊ منافقین کی گواہی کے باوجود باری تعالیٰ کا انکار	۸۷
❊ نبوت کی من گھڑت تقسیم	۸۸
❊ نزولِ عیسیٰ ختمِ نبوت کے منافی نہیں	۸۹
❊ حضرت عیسیٰ کے بحیثیتِ امتی تشریف لانے کے دلائل	۹۰
❊ موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو میری ہی اتباع کرتے	۹۱
❊ منکرین کی دلیل سے دعویٰ کا اثبات	۹۲
❊ کیا حضور کی اتباع سے حضرت عیسیٰ کی نبوت میں فرق آئے گا؟	۹۲
❊ مشرکین کا اعتراض اور اس کا جواب	۹۴
❊ ایک نکتہ	۹۴
❊ لفظِ خاتم میں تاء کے کسرہ اور فتحہ دونوں سے ختم نبوت کا ثبوت	۹۵
❊ اسلوبِ قرآنی اور ختمِ نبوت کا ثبوت	۹۶
❊ ختمِ نبوت کی تمثیلی دلیل	۹۶
❊ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ خصوصیات	۹۷
❊ جوامع الکلم کے دو مطلب	۹۸
❊ حضور کا رعب اور اس کی دو خصوصیتیں	۹۹
❊ امتِ محمدیہ کے لئے مالِ غنیمت کی حلت اور اس کی وجہ	۱۰۰
❊ چوتھی خصوصیت	۱۰۱

❊ پانچویں خصوصیت	۱۰۲
❊ چھٹی خصوصیت	۱۰۲
❊ نبی کی خصوصیات کسی اور میں تسلیم کرنا بھی مستلزمِ کفر ہے	۱۰۳
ختمِ نبوت کے تقاضے اور چند باطل فرقوں کا تعارف	
❊ آیتِ مبارکہ کے دو پہلو	۱۰۵
❊ خاتمیتِ محمدی کی جامعیت	۱۰۶
❊ غیر اسلامی کلچر سے متاثر ہونا ختمِ نبوت کو نہ سمجھنا ہے	۱۰۶
❊ بدعت خاتمیت کے منافی ہے	۱۰۷
❊ خاتمیت معاملات اور معاشرت کو بھی حاوی ہے	۱۰۸
❊ سنتِ رسول ہمارے لئے فخر کا باعث ہے	۱۰۹
❊ مسلمانوں کی بے عزتی کا سبب	۱۰۹
❊ فرقۂ نیچریہ کی بنیادی غلطی	۱۱۱
❊ فرقۂ نیچریہ کے موجد	۱۱۲
❊ فرقۂ نیچریہ کے چند باطل نظریات	۱۱۲
❊ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں فرقۂ نیچریہ کا اثر	۱۱۴
❊ فرقۂ نیچریہ کے بارے میں علماءِ حرمین کا فتویٰ	۱۱۴
❊ فرقۂ چکڑالویہ	۱۱۵
❊ کتابتِ احادیث کا مبدا	۱۱۵
❊ صحابہ اور محدثین کے حافظے کرامات سے کم نہیں	۱۱۶

❊ ائمہ اسماء الرجال کا امت پر احسان	۱۱۶
❊ ان الحکم الا للہ کا جواب	۱۱۷
❊ نبی کا حکم آیۃ من القرآن ہوتا ہے	۱۱۹
❊ گناہ کرنا عقل کے سالم نہ ہونے کی دلیل ہے	۱۲۰
❊ احادیثِ مبارکہ کے ظنی ہونے کا شبہ ؟	۱۲۱
❊ ظن کے معانی	۱۲۱
❊ احادیثِ مبارکہ کے ظنی ہونے کا مطلب ؟	۱۲۲
❊ علماء پر اعتماد اور ان کی رہنمائی ضروری ہے	۱۲۳
❊ پرویزی فتنہ کا تعارف	۱۲۳
❊ غلام احمد پرویز کے نظریات	۱۲۴
❊ فرقۂ صدیق دیندار	۱۲۶
❊ صدیق دیندار کا تعارف	۱۲۶
❊ صدیق دیندار کے نظریات	۱۲۶
❊ آغاخانی فرقہ کا تعارف	۱۲۷
❊ شیعوں کے بارہ امام	۱۲۹
❊ آغاخانی لقب کیسے ملا	۱۳۰
❊ آغاخانیوں کے نظریات	۱۳۱
❊ بوہریہ فرقہ کا تعارف	۱۳۲
❊ بوہریوں کے نظریات	۱۳۳

❊ مرتد فرقوں کا شرعی حکم	۱۳۶
اسلام کی جامعیت:	
❊ تکمیل دین کا مطلب	۱۳۷
❊ یہود کی ایک حسرت	۱۳۸
❊ کیا تکمیل دین کے اعلان سے قبل دین ناقص تھا؟	۱۳۹
❊ نظامِ زندگی اور اس کا مقصد	۱۴۰
❊ اسلامی تہذیب خود ساختہ نہیں ہے	۱۴۱
❊ اسلام کی خصوصیت	۱۴۲
❊ مشرکین کا اعتراض اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا جواب	۱۴۲
❊ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے شفیق باپ کی طرح ہیں	۱۴۳
❊ آدابِ استنجا اور اس کے فوائد	۱۴۳
❊ استنجا سے قبل دعا کی اہمیت	۱۴۴
❊ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی موت کا واقعہ	۱۴۴
❊ استنجاء میں قبلہ کی جانب رخ یا پشت نہ کریں	۱۴۵
❊ دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کریں	۱۴۶
❊ استنجا میں ڈھیلے کا استعمال اور اس کے فوائد	۱۴۶
❊ سنت پر عمل کرنے میں دین اور دنیا دونوں کا فائدہ ہے	۱۴۷
❊ دو کھجور ایک ساتھ کھانے کی ممانعت اور اس کی وجہ	۱۴۷
❊ خلال اور اس کے فوائد	۱۴۷

❊ خُلالہ کو پھینکنے کی حکمت	۱۴۸
❊ دین پر استقامت کے ساتھ چلنے کے لئے مجاہدہ اور عزم درکار ہے	۱۵۰
❊ صحابہ کی استقامت اور انعاماتِ خداوندی	۱۵۰
اسلام پر ثابت قدم رہیں:	
❊ دنیا جائے آزمائش ہے	۱۵۳
❊ غم اور خوشی نظامِ رب ہے	۱۵۴
❊ غم اور خوشی کیوں؟	۱۵۴
❊ یہ عشق نہیں فسق ہے	۱۵۶
❊ حالات کمال ایمان کے لئے بھی آتے ہیں	۱۵۷
❊ شرح صدر کا مطلب	۱۵۸
❊ شرحِ صدر کی علامات	۱۵۸
❊ صحابہ کرام کو یہ سعادت حاصل تھی	۱۵۸
❊ شرح صدر کے حصول کا طریقہ	۱۵۹
❊ شرح صدر والی کیفیت	۱۵۹
❊ اللہ کی ربوبیت پر راضی رہنے کا مطلب	۱۶۰
❊ حضور کی نبوت پر راضی رہنے کا مطلب	۱۶۰
❊ ضیقِ صدر کا مطلب	۱۶۱
❊ منافق کا دل حرجہ کی طرح ہوتا ہے	۱۶۱
❊ ذکر اللہ سے وحشت نفاق اور گمراہی کی علامت ہے	۱۶۲

❊ شرح صدر کب حاصل ہوتا ہے؟	۱۶۳
❊ جس کو شرح صدر نہ ہو وہ ملعونِ خدا ہوتا ہے	۱۶۳
❊ اسلام پر چلنے کے دو انعام	۱۶۴
❊ دوسرا انعام	۱۶۵
عظمتِ الٰہی اور اس کا استحضار	
❊ زندگی گزر گئی لیکن اللہ کا نام لینا نہیں آیا	۱۶۷
❊ محض علم کافی نہیں استحضار چاہئے	۱۶۸
❊ میرے شیخ حضرت مسیح الامت کا ایک ملفوظ	۱۶۹
❊ اللہ کا نام لینے کا طریقہ	۱۶۹
❊ اللہ کی عظمت و کبریائی	۱۷۰
❊ اللہ کا نام بھی برکت اور عظمت والا ہے	۱۷۱
❊ اللہ کا اسم مبارک آسمان و زمین کے مقابلہ میں بھاری ہے	۱۷۱
❊ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ	۱۷۱
❊ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عظمتِ الٰہی کا اثر	۱۷۲
❊ اللہ کی بڑائی نبی اور فرشتوں کی زبانی	۱۷۲
❊ اللہ کے ہاں دنیا کی بے وقعتی	۱۷۳
❊ نماز میں بار بار تکبیر کیوں؟	۱۷۴
❊ ذاتِ الٰہ کا تصور منع ہے قدرت و عظمت کا نہیں	۱۷۴
❊ عظمت کا استحضار کیوں؟	۱۷۴

❊ اذان اور نماز کا مقصد عظمتِ الٰہی کا اظہار بھی ہے	۱۷۵
❊ عظمتِ الٰہی کے استحضار سے حضرت شیخ کی کیفیت	۱۷۵
❊ معاشرہ کی بد عملی کی ایک اہم وجہ	۱۷۶
❊ حقیقی مسلمان تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ممتاز ہوتا ہے	۱۷۸
❊ اللہ کی عظمت اور کبریائی پیدا کرنے کا طریقہ	۱۷۹
اختیاری اور غیر اختیاری حالات میں کیسے رہیں؟	
❊ دو حالتوں سے انسان کو مفر نہیں	۱۸۰
❊ بے اطمینانی کیوں؟	۱۸۱
❊ تقدیر نہ بدل سکتی ہے اور نہ چوک سکتی ہے	۱۸۱
❊ فعل کی نسبت اپنی جانب کرنا غلط ہے	۱۸۲
❊ تقدیر ایمان لانا ایمان کا رکن ہے	۱۸۲
❊ فرقۂ قدریہ اور حضور ﷺ کی پیشین گوئی	۱۸۳
❊ مسئلۂ تقدیر ماوراء عقل ہے	۱۸۳
❊ تقدیر اللہ کا بھید ہے	۱۸۳
❊ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ	۱۸۴
❊ تقدیر تسلی کا ذریعہ ہے:	۱۸۴
❊ حضرت ابراہیم کا انتقال اور آپ ﷺ کی کیفیت	۱۸۶
❊ یہ رحمت ہے	۱۸۷
❊ غیر اختیاری مصائب میں شریعت کا حکم	۱۸۷

❊ مصائب کے اسباب اختیاری ہوں تو ہمارا طرزِ عمل کیا ہو؟	۱۸۸
❊ چھوٹی مصیبت کو جھیل لینا بڑی مصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے	۱۸۸
❊ کسی مسلمان کو گالی دینا	۱۸۹
❊ ہندوستان میں ٹریفک کی بد نظمی اور اس سے ایک سبق	۱۹۰
❊ نفل نماز اور روزوں سے بڑا عمل	۱۹۱
❊ تعلقات کا بگاڑ دین کی تباہی کا ذریعہ ہے	۱۹۲
آخرت کی تیاری کریں:	
❊ حق تعالیٰ کی بندوں پر شفقت اور مہربانی	۱۹۳
❊ تحذیر بھی شفقت پر مبنی ہوتی ہے	۱۹۴
❊ انسان کی ایک خصوصیت	۱۹۵
❊ جزاء اور سزا عقل کے اعتبار سے ہے	۱۹۵
❊ غور و فکر کی تاکید کیوں؟	۱۹۶
❊ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر	۱۹۶
❊ غور و فکر کیسے کیا جائے؟	۱۹۷
❊ خدا کے ایک سے زیادہ نہ ہونے کی عقلی دلیل	۱۹۸
❊ جزا اور سزا کے نظام میں غور و فکر	۱۹۹
❊ نفعِ عاجل پر نظر اور انجام سے بے خبر کی مثال	۲۰۰
❊ ایک اور مثال	۲۰۰
❊ اچھے اور برے ہر گز برابر نہیں ہو سکتے	۲۰۱

❊ دائمی نفع ملحوظ رکھنا چاہیے	۲۰۲
❊ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کا وقت	۲۰۳
❊ آخرت کی بھلائی خالص بھلائی ہے	۲۰۴
❊ دنیا کے عیش میں مشقت اور تکدر ہے	۲۰۴
❊ جنتی سر درد اور بے ہودہ بکواس سے بھی محفوظ رہیں گے	۲۰۴
❊ جنتی حسد اور کینہ سے پاک ہوں گے	۲۰۵
❊ دنیا خواہشات کی تکمیل کی جگہ نہیں	۲۰۵
❊ ارادوں کے ٹوٹنے سے رب کو پہچانیں	۲۰۶
❊ اعمال میں غور و فکر	۲۰۶
❊ کل سے کونسا کل مراد ہے؟	۲۰۷
❊ اعمال کا تفصیلی محاسبہ ضروری ہے	۲۰۸
❊ تسبیح کے دو فائدے	۲۰۹
❊ زکوۃ و صدقات کا محاسبہ کریں	۲۱۰
❊ سال میں دو مرتبہ ختمِ قرآن قرآن مجید کا حق ہے	۲۱۰
❊ بچوں کی صحیح تعلیم نہ ہونے پر بھی مؤاخذہ ہوگا	۲۱۲
❊ بچہ کی مثال خام میٹریل کی ہے	۲۱۲
❊ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں	۲۱۳
❊ اسلوب قرآنی شفقت سے بھرپور ہے	۲۱۳
❊ مشابہت کی اہمیت دنیا والوں کی نظر میں	۲۱۴

❊ غیروں کی مشابہت پر وعید	۲۱۴
❊ بے نمازی کا حشر قارون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ کیوں ہو گا؟	۲۱۵
ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے	
❊ عقل مند شخص کون؟	۲۱۷
❊ دنیا میں نفس کا محاسبہ قیامت میں تخفیف کا سبب ہے	۲۱۸
❊ تقویٰ محاسبہ سے پیدا ہوتا ہے	۲۱۸
❊ ہم سے بڑا بے وقوف کون ہو گا؟	۲۱۹
❊ ہر سانس ایک قدم ہے	۲۲۰
❊ نظر سوئے دنیا قدم سوئے مرقد	۲۲۰
❊ موت سے کسی کو فرار نہیں	۲۲۱
❊ کفارِ مکہ کا طعن اور اس کا جواب	۲۲۱
❊ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے:	۲۲۲
❊ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چند اشعار	۲۲۳
❊ دنیا کا قیام ریلوے اسٹیشن میں ویٹنگ روم کے قیام کی طرح ہے	۲۲۴
❊ دنیا سے دل کیسے ہٹائیں؟	۲۲۴
❊ موت کو کثرت سے یاد کرنے والا شہید کا درجہ پاتا ہے	۲۲۵
❊ موت کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی کیفیت	۲۲۶
❊ موت کے وقت تکلیف کی ایک اور حکایت	۲۲۷
❊ موت کی تکلیف حضرت کعب کی زبانی	۲۲۷

❊ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور موت کی تکلیف کی ایک مثال	۲۲۷
❊ بنی اسرائیل کے چند عابدوں کی حکایت	۲۲۸
❊ موت کی سختی سے پناہ مانگیں	۲۲۸
❊ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ملک الموت کو دیکھ کر بے ہوش ہو جانا	۲۲۹
❊ موت کے وقت نیک مومنین کے حالات	۲۲۹
❊ امتی قبر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پہچان پائیں گے؟	۲۳۰
❊ نیک مومنین کے لئے قبر میں جنت کا لباس اور بستر ہو گا	۲۳۱
❊ نیک اعمال خوبصورت انسان کی شکل میں	۲۳۱
❊ نیک مومن کی ملاقاتیں	۲۳۲
❊ کافر اور گنہگاروں کے حالات	۲۳۲
❊ منکر اور نکیر کی حالت	۲۳۲
❊ کافروں کے لئے قبر میں آگ کا لباس اور بستر ہو گا	۲۳۴
❊ برے اعمال کی شکل	۲۳۴

عرضِ مرتّب:

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین امابعد!

اس بات کا اظہار کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی کہ تذکیراتِ جمعہ جلد اول کی عوام وخواص میں مقبولیت کے بعد اسی کی دوسری جلد سابقہ ترتیب کے ساتھ بعون اللہ ہم قارئین کی نذر کر رہے ہیں، اگرچہ اس جلد کا مسودہ پہلی جلد کی طباعت کے بعد بہت ہی جلد تیار ہو چکا تھا، لیکن کچھ وجوہات کی بنیاد پر اس کی اشاعت عمل میں نہ آسکی، نیز اس دوران حالات کے تقاضوں اور احباب کے اصرار پر حضرت کے دیگر انتہائی اہم افادات ''فتنے اور اختلافات'' طبع ہو کر منظر عام پر آئے، جس کی اہمیت اورافادیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

تاخیر کی اس معذرت کے ساتھ بارگاہ رب العالمین میں شکریہ ادا کرتے ہوئے تذکیراتِ جمعہ جلد دوم اب آپ کے حوالہ ہے۔

افادہ واستفادہ میں سہولت اور دیگر مصالح کے پیشِ نظر افادات کی ترتیب سے متعلق چند باتیں قارئین کی خدمت میں پیش ہیں :

(۱) جلد دوم میں ایمانیات سے متعلق بیانات کی ترتیب قائم رکھی گئی ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ مختصر، اور منظم انداز میں ان افادات کو قارئین کی نذر کیا جائے۔

(۲) قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، واقعات و تفاسیر کی المکتبۃ الشاملۃ کی موافق للمطبوع کتب کے ذریعے حتی الامکان تخریج کی گئی۔ اور بالخصوص نصوص کے عربی متن کو بھی نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

(۳) عربی عبارات پر اعراب کا اہتمام کیا گیا۔

(۴) ربط و ترتیب کا اہتمام کیا گیا۔

(۵) تصحیحِ املاء کی بھی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔

(۶) ممکنہ طور پر تحریری قالب میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان خطبات کا انداز خطابی بھی رہے، تاکہ قارئین ایک طرف حضرت والا کے خطابی انداز سے محظوظ ہوں تو دوسری طرف الہامی کلمات کی برکت سے بھی مستفید ہوں۔

(۷) موضوع سے متعلق عوام کی استعداد کے مطابق مواد باقی رکھا گیا۔

(۸) کہیں کہیں حضرت کے ایماء پر موضوع سے متعلق کچھ مواد کا اضافہ کیا گیا۔

اس موقع پر راقم الحروف شریعہ بورڈ آف انڈیا کے سبھی اعوان و انصار بالخصوص برادرِ مکرم مفتی محمد رضاء الرحمن عابد صاحب قاسمی، مفتی محمد انعام الرحمن جمیل صاحب قاسمی اور مولانا عتیق الرحمن صاحب فاروقی صاحب، کا بے حد ممنون و مشکور ہے کہ جنہوں نے ترتیب، تخریج، پروف ریڈنگ اور کتاب کی طباعت و تزیین میں اہم مشوروں کے ذریعہ قابلِ قدر تعاون کیا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر معتمدِ ادارہ برادر مکرم محترم مولانا محمد ضیاء الرحمن عقیل صاحب حسامی کا تذکرہ نہ کروں کہ جن کی نگرانی سے انتظامی امور عافیت اور سہولت کے ساتھ تکمیل پائے۔

نیز اس موقع پر بندہ کے لئے بے انتہاء مسرت اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسودہ پر صاحبِ افادات سیدی و مولائی والد بزرگوار حضرت مفتی محمد نوال الرحمن صاحب ادام اللہ ظلہ وعافاہ نیز استاذِ محترم حضرت مولانا سید احمد ومیض صاحب ندوی دامت

کا تہم خلیفہ عارف باللہ حضرت پیر ذالفقار صاحب دامت برکاتہم (بورڈ ممبر ادارۂ ہذا) نے بھی نظر کرم فرمائی۔

ہر چند کہ اس بات کا لحاظ کیا گیا کہ یہ خطبات ہر طرح سے مرتب، مدلل اور مزین قارئین کی خدمت میں پیش کریں لیکن چونکہ یہ ایک بشری کاوش ہے، جس میں لغزش وخطا کا امکان بہر صورت باقی ہے، اس لئے اہل علم سے درخواست ہے کہ اگر اس میں کوئی بات قابلِ استفسار نظر آئے تو اس کو احقر کی کم علمی اور کوتاہی سمجھیں، اور اس کی نشاندہی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ پاک حضرت کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے، اور حضرت کو صحت عطا فرمائے، اور حضرت کے ان خطبات کو عوام وخواص ہر دو کے لئے مفید بنا کر شرفِ قبولیت سے نوازے، اور زیادہ سے زیادہ حضرت کے علوم ومعارف کی اشاعت کی ہم کو توفیق نصیب فرمائے، اور ہم سب کے لیے ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے۔ (آمین)

مفتی محمد عطاء الرحمن ساجد قاسمی

(مدیر شریعہ بورڈ آف انڈیا)

توحیدِ الٰہی اور اس کی اقسام

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ”قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا“ (الشمس:۹تا۱۰)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کر لیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا۔

برادرانِ اسلام!

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نفس کو سنوارنے، اور نفس کا تزکیہ کرنے والے کو کامیاب قرار دیا ہے، اور اس کے بالمقابل نفس کا تزکیہ نہ کرنے والے اور اس کو فسق و فجور میں مبتلا رکھنے والے کو ناکام اور نامراد قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ کیا ہے؟ اور نفس کی گندگی کیا ہے؟

تزکیہ کا مطلب:

تزکیہ کے معنیٰ پاکی کے ہیں، پھر سوال ہوا کہ پاکی سے کونسی پاکی مراد ہے؟ اور اللہ کے یہاں پاکی کا کیا مطلب ہے؟ اور اللہ کو کونسی پاکی مطلوب ہے؟ کیونکہ ہمیں وہی پاکی

مطلوب ہے جو اللہ کے یہاں مطلوب ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی شروعات یقین کی پاکی سے ہوتی ہے، اور یقین کی پاکی کا مطلب یہ ہے کہ صحیح اور واقعہ کے مطابق بات کو اپنے دل اور دماغ میں بٹھایا جائے، اور یقین کی ناپاکی یہ ہے کہ خلافِ واقعہ اور غلط بات کو دل میں بٹھایا جائے، اور یہ بھی گندگی کی ایک قسم ہے، اور یہ گندگی در اصل روحانی گندگی ہوتی ہے۔ فزیکل ومادی گندگی الگ ہوتی ہے، روحانی گندگی الگ ہوتی ہے، دونوں میں فرق ہے۔ البتہ روحانی گندگی فزیکل ومادی گندگی کے مقابلہ میں خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ جو شئ جتنی زیادہ لطیف ہوتی ہے، اس کی تاثیر بھی اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے اس کی گندگی کئی درجہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے، غرض یقین کی گندگی کا مطلب یہ ہے کہ خلافِ واقعہ اور خلافِ شرع بات کو دل و دماغ میں بٹھایا جائے۔ اس کو اصطلاح میں عقیدہ کہتے ہیں، اور خلاف شرع بات کا مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ پر ہماری نظر ہو جائے، خالق سے نظر ہٹ کر مخلوق کی طرف ہو جائے، چاہے عبادت و پرستش میں، چاہے حاجات و مصائب میں۔

علم، عقل اور تزکیہ کا محل:

اس گندگی کا محل در اصل قلب اور دل ہے، اور تزکیہ در اصل یہیں سے شروع ہوتا ہے، یہیں سے فکر کا تزکیہ ہوتا ہے، یہیں سے عقل کا تزکیہ ہوتا ہے، یہیں سے علم و یقین کا تزکیہ ہوتا ہے اور یہیں سے عقائد کا تزکیہ ہوتا ہے، اور یہ سب سے ضروری چیز ہے، اگر اسی کا تزکیہ نہ ہو تو سارے اعمال اکارت اور بے کار ہو جاتے ہیں۔

ویسے بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ عقل کا تعلق دل سے ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا: ”وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا“ (الاعراف: ۱۷۹)

اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کئے ہیں جن کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

"أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا" (الحج:۴۶)

"سو کیا یہ (منکر) لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں جس سے ان کے دل ایسے ہو جاویں کہ ان سے سمجھنے لگیں"

اس سے پتہ چلا کہ عقل اور فہم کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ دل بادشاہ اور دماغ وزیر ہوتا ہے۔

عوام الناس کی ایک جہالت؟

اس لئے سب سے پہلے دل کا تزکیہ ضروری ہوتا ہے، لیکن محض دل کا تزکیہ بھی کافی نہیں ہے بلکہ دل کے ساتھ ظاہر کا تزکیہ بھی ضروری ہے، دونوں قسم کی گندگیوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا ضروری ہے، اگر صحیح معنٰی میں دل کا تزکیہ ہو تو پھر ظاہر کا بھی تزکیہ ہو جاتا ہے، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اصل تو دل ہے، اس لئے اگر وہ صاف اور پاک ہو تو کافی ہے، چاہے ظاہر کیسا ہی کیوں نہ ہو، یہ در اصل جہالت کی بات ہے، اور اس طرح کی بات کہنا یہ خود بھی دل کی گندگی کی علامت ہوتی ہے، دل میں جو ہوتا ہے ظاہر میں آدمی ویسا ہی کرتا ہے، یہ در اصل گناہ کرنے کا بہانہ یا گناہ کی شرمندگی سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ قرآن پاک میں کہا گیا: "وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ" (الانعام:۱۲۰)

"اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی عنقریب سزا ملے گی"

اللہ کے ہاں باطن بھی ظاہر ہے:

اللہ کے ہاں اِن سائیڈ (Inside) اور آؤٹ سائیڈ (Out side) ایک ہی ہے، ظاہر اور باطن دونوں اللہ کے پاس ظاہر ہی ہے۔ ہم روح کو نہیں دیکھ سکتے مگر اللہ پاک دیکھ سکتے ہیں، ہم دل کو نہیں دیکھ سکتے مگر اللہ پاک دیکھ سکتے ہیں، ہم فکر اور سوچ کو نہیں دیکھ سکتے لیکن اللہ پاک دیکھتے ہیں، جو مادی چیز ہے وہ بھی اللہ پاک دیکھتے ہیں اور جو غیر مادی (مجرد) چیز ہے وہ بھی اللہ پاک دیکھتے ہیں، لیکن ان کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں ہے۔

آنکھوں کی چوری اور دل کے راز کو بھی وہ جانتا ہے:

"يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ" (الغافر: ۱۹)

"وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور ان (باتوں) کو بھی جو سینوں میں پوشیدہ ہیں"

آنکھ جب خیانت کرتی ہے تو وہ اس کو بھی جانتے ہیں، آنکھ کسی کی پکچر لینے کے بعد اندر جو گڑبڑ کرتی ہے اور اس کی وجہ سے اندرون میں جو وساوس اور خیالات آتے ہیں اس کو بھی وہ جانتے ہیں، کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ کسی کی تصویر کو دیکھنے کے بعد اندر کیا ہو رہا ہے؟ لیکن اللہ دیکھتے بھی ہیں اور جانتے بھی ہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ اس لئے دونوں اعتبار سے پاکی ضروری ہے۔

ہماری نظر غیر اللہ پر کیوں؟

بات دراصل یہ ہے کہ انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، اور اس دنیا کی چیزوں کو دیکھتا ہے، اور یہاں کے احوال اور واقعات کو دیکھتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں یہاں کی چیزیں رچ بس جاتی ہیں، اور اسی میں وہ منہمک ہو جاتا ہے، اور اسی کو سب کچھ سمجھنے

لگتا ہے، اس لئے دنیا میں آنے کے بعد جو کام سب سے اہم ہے وہ قلب کا تزکیہ اور عقائد کی درستگی ہے، چونکہ ہم مادہ سے بنے ہوئے ہیں اور مادیت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اس لئے مادہ پرستی میں مبتلا ہیں، ہمیں مادہ پرستی سے نکلنا ہے، اور اللہ کی ذات اور صفات کا یقین دل میں بٹھانا ہے، دنیا پرستی کی گندگی اور اس کی طرف میلان کو ختم کرنا ہے، غیر اللہ کا یقین دل سے نکالنا ہے، کیونکہ یہی چیز یقین کی گندگی ہے کہ انسان کی نظر غیر اللہ پر ہو، خالق اللہ ہیں، مالک اللہ ہیں، رازق اللہ ہیں، حاکم اللہ ہیں، رب اللہ ہیں، معبود اللہ ہیں، اس یقین کو دل میں بٹھانا ہے، اگر ہم اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز میں کسی کو بھی شریک کرتے ہیں تو وہ شرک ہے، جو سب سے بڑا گناہ ہے، وہ جھوٹ ہے، وہ الزام ہے، وہ بہتان ہے۔

شرک کی کبھی معافی نہیں ہوگی:

قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا: ”وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يَابُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ“ (لقمان:۱۳)

”اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے“

یہ ایسا گناہ ہے کہ اس کی کبھی معافی نہیں ہے، اس کے علاوہ ہر گناہ کی معافی ہو سکتی ہے، لیکن اس کی معافی کبھی بھی نہیں ہوگی۔

”إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا“ (النساء:۴۸)

”بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہو گا وہ گناہ بخش دیں گے اور

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا"

شرک سب سے بڑا گناہ ہے، سب سے بڑا جھوٹ ہے، اور سب سے بڑی گندگی ہے، اس سے بڑا کوئی جھوٹ نہیں، اس سے بڑی گندگی کوئی نہیں، اور یہ چیز اللہ کو بالکل بھی برداشت نہیں۔

آپ اندازہ کیجئے کہ جس بات کے بارے میں حق تعالیٰ صراحت کے ساتھ فرمارہے ہیں کہ وہ جس گناہ کو چاہے معاف فرمادیں گے لیکن شرک کو کبھی معاف نہیں کریں گے تو وہ اللہ کے نزدیک کتنا سخت اور کتنا بڑا گناہ ہوگا! اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے جہنم، اور ہمیشہ کے لئے رسوائی اور ذلت اٹھانی پڑے۔ الا یہ کہ توبہ کرلی جائے۔

ایک مرتبہ کلمۂ طیبہ کہنے کی اہمیت:

کیونکہ اگر کوئی ستر سال تک بت پرستی کرتا رہا، اور اس کے بعد ایک مرتبہ بھی کلمہ شہادت پڑھ لیا تو اس کے ستر سال کے کفریہ اور شرکیہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ" (صحیح مسلم: کتاب الایمان، ۳۳۶)

بے شک اسلام پہلے کے تمام گناہوں کو منہدم کردیتا ہے۔

اس سے اللہ کی رحمت اور اس کے رحم وکرم کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بندوں پر کتنا مہربان ہے کہ اتنی سخت ناراضگی کے باوجود صرف ایک مرتبہ اس کے ایک ہونے کی شہادت اور اس کا اقرار کرتے ہی وہ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ اگر اس کے معبودِ واحد ہونے کا کلمہ نہ پڑھا جائے اور اس کی شہادت نہ دی جائے اور ساری زندگی آدمی نیک کام کرتا رہے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

اسی لئے سب سے پہلے ایمان کی پاکی ضروری ہے، اور ایمان کی پاکی کا مطلب یہی ہے

کہ اللہ کے ایک ہونے کا یقین دل میں بٹھایا جائے، اور اس کے فاعل حقیقی ہونے اور رب ہونے کا یقین دل میں بٹھایا جائے، اس کے مالک اور حاکم ہونے کا یقین دل میں بٹھایا جائے۔ اور جس قدر یہ یقین پختہ ہوتا ہے اور جتنا اس کا استحضار ہوتا ہے اتنا ہی اس کا قلب صاف ہوتا ہے، اور اس کے قلب سے یہ گندگی نکلتی رہتی ہے، اور اس کے ایمان کے نور میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کا اثر اس کے اعمال اور دوسری چیزوں پر پڑتا ہے، اس کے ارادے اور اس کی نیتیں پاک اور صاف ہو جاتی ہیں، اس کی سوچ اور فکر پاک ہو جاتی ہے، اس کی خواہشات صحیح ہو جاتی ہیں، نیکیوں کی طرف رغبت ہونے لگتی ہے، برائیوں سے نفرت ہونے لگتی ہے، یہ سلسلہ پوری زندگی کو محیط ہو جاتا ہے، جیسے جیسے قلب ایمانی نور سے منور ہوتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی زندگی میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔

اسی وجہ سے سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالی نے ہم کو ایمان کا مکلف کیا ہے، اور شرک کی گندگی کو دل سے نکالنے کا حکم دیا ہے۔ ایمان صرف زبان سے کلمہ کہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ زبان سے کلمہ کہنے کے بعد اس کو سیکھنا اور سمجھنا بھی پڑتا ہے، زبان سے الفاظ ادا کرنا الگ چیز ہے، اگرچہ یہ بھی فضیلت اور اہمیت کا حامل ہے، لیکن اس کی حقیقت کو دل میں بٹھانا اور جمانا بھی ضروری ہے۔

توحید صرف واحد گفتن کا نہیں بلکہ واحد دیدن اور واحد دانستن کا نام ہے:

کسی بزرگ نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ توحید واحد گفتن کا نام نہیں ہے، بلکہ واحد دانستن کا نام ہے، کہنا کافی نہیں ہے، بلکہ دل میں اتر جانا اور دل سے اس کا یقین ہو جانا اصل توحید ہے، صوفیا فرماتے ہیں کہ توحید کا کمال واحد گفتن، واحد دانستن، اور واحد دیدن ہے۔ ہماری توحید صرف زبانی ہے، جو زبان تک محدود ہے، جب کہ اولیاء اللہ کی توحید حالی اور دل میں اتری ہوئی ہوتی ہے۔

توحید کی دو بنیادی قسمیں:

توحید کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، (۱) توحیدِ اعتقادی: یعنی حق تعالیٰ کو ذات اور صفات میں یکتا ماننا۔ (۲) توحیدِ قصدی یعنی حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مقصود اور مطلوب نہ بنانا۔ اس کا ایک جزء ریا بھی ہے، ان دونوں کے مجموعہ سے توحید فی العبادت اور توحید فی الالوہیت حاصل ہوتی ہے۔

توحید کی تیسری قسم:

اس کے علاوہ توحید کی ایک قسم توحیدِ وجودی بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو وجود میں یکتا سمجھ لیا جائے، جس کی وجہ سے اس کا اثر یہ ہو کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا اثر طبیعت پر نہ ہو، اور حق تعالیٰ کے علاوہ سے بالکلیہ قطع نظر کر لیا جائے۔ (خطبات حکیم الامت: ۱۸/۱۰۰) یہ درجہ مقصود نہیں ہے لیکن دوسرے مطلوب درجات میں اس سے سہولت اور کمال پیدا ہوتا ہے۔

توحید اعتقادی کے چار درجات:

پھر توحیدِ اعتقادی کے مختلف درجے ہیں، جنہیں اصطلاح میں توحیدِ ذاتی، توحیدِ صفاتی، توحیدِ افعالی اور توحیدِ آثاری سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہم لوگ ایمان لے آتے ہیں لیکن اس کے مراتب اور گہرائیوں میں اولیاء اللہ لے جاتے ہیں۔

توحیدِ ذاتی:

توحید ذاتی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، جیسے کسی کو اللہ کا بیٹا قرار دینا، یا کسی کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا، یا کسی کو اللہ کی بیوی قرار دینا یا کسی کو اللہ کا پارٹ یا اس کا حصہ یا اس کا جزء قرار دینا، یا اللہ کا رشتہ دار بنا دینا،

جیسے یہود حضرت عزیر رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، اور نصاری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، اور جنات اور اللہ پاک کے درمیان رشتہ داری قرار دیتے تھے، ان سب کا رد کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

"وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصَارىٰ الْمَسِيْحُ ابْنُ اللهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ" (التوبہ:۳۰)

اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ (میں سے اکثر) نے کہا کہ مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا، یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں۔ خدا ان کو غارت کرے! یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں"

"وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۔ سُبْحَانَ اللهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ" (الصافات:۱۵۸ و ۱۵۹)

ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور جنات میں (بھی) رشتہ داری قرار دی ہے اور ان میں جو جنات ہیں خود ان کا یہ عقیدہ ہے کہ (ان میں جو کافر ہیں) وہ (عذاب میں) گرفتار ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہیں جو یہ بیان کرتے ہیں۔

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ۔ اللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ" (الاخلاص: ۱ تا ۳)

آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمال ذات اور صفات میں) ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے (کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں) نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، یہ توحید ذاتی کا خلاصہ ہے۔

صوفیاء کے ہاں توحیدِ ذاتی میں توحید وجودی بھی ہوتی ہے۔ جس کی کچھ وضاحت اوپر آچکی ہے کہ کائنات میں اللہ ہی کو موجود بالذات جاننا۔

توحیدِ صفاتی:

توحیدِ صفاتی کا مطلب یہ ہے کہ بندوں سے صفاتِ کمال کی نفی کر کے اللہ کے لئے کامل صفات مانی جائیں، اور جو صفات حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں ان میں حق تعالیٰ کو یکتا ماننا اور یہ عقیدہ اور یقین رکھنا کہ جیسی صفات حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، ویسی صفات کسی اور میں نہیں، ان کی صفات کامل ہیں، اور مخلوق کی صفات ناقص ہیں، یہ توحید توحیدِ صفاتی کہلاتی ہے، پھر صفاتِ الٰہیہ کو سوچنے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے، کافر کے سوچنے کا انداز الگ ہوتا ہے اور مومنین کے سوچنے کا انداز الگ ہوتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی من جملہ صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع یعنی سننے والے ہیں، کافر بلکہ بعض باطل فرقوں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اللہ ہماری ہی طرح سنتا ہے اور ہماری ہی طرح دیکھتا ہے، لیکن مومن کا عقیدہ یہ ہے: هُوَ يَسْمَعُ لَا كَسَمْعِنَا، هُوَ يَبْصُرُ لَا كَبَصَرِنَا، وہ سنتا ہے لیکن ہمارے سننے کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے لیکن ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ سننے میں کان کا محتاج نہیں، لیکن ہم سننے میں کان کے محتاج ہیں، ہمارا سننا لمیٹیڈ (Limited) اور محدود ہوتا ہے، لیکن اس کے پاس کوئی لمٹ اور کوئی حد نہیں ہے، زیادہ دور کی بات ہم نہیں سن سکتے، زیادہ گڑبڑ میں بھی ہم نہیں سن سکتے، زیادہ آہستہ بات بھی ہم نہیں سن سکتے، دس لوگوں کی بات ایک ساتھ ہم نہیں سن سکتے، لیکن اللہ پاک ہر ایک کی سنتا ہے، دور کی بھی سنتا ہے اور قریب کی بھی سنتا ہے، پست آواز بھی سنتا ہے، اور بلند آواز بھی سنتا ہے، ایک کی آواز کو بھی سنتا ہے اور پوری مخلوق کی آواز کو بھی سنتا ہے، اور ایک ہی ساتھ سنتا ہے، بلکہ پوری مخلوق کا کہنا اسی کے ارادہ سے ہوتا ہے اور پھر سب کی ندا اور سب کا سوال وہ ایک ساتھ سنتا ہے، انسانوں کی بھی سنتا ہے اور جانوروں کی بھی سنتا ہے، جمادات کی بھی سنتا ہے اور نباتات کی بھی سنتا ہے، ہمارے پاس الفاظ

نہیں ہیں اس کی ایک صفت کی تعریف کرنے کے لئے، اس کی ذات اور صفات کو الفاظ کے ذریعہ نہیں سمجھایا جاسکتا، حقیقت کو تو بس وہی جانتا ہے۔

توحیدِ افعالی:

توحید کی تیسری قسم توحید فی الافعال ہے، یعنی کائنات میں فاعلِ حقیقی اور آمرِ حقیقی صرف اور صرف اللہ ہی کو ماننا اور غیر اللہ سے فعل کی نفی کرنا توحید افعالی کہلاتی ہے، کائنات میں جو جو کام ہو رہے ہیں ان سب کا فاعل اللہ ہے، جتنے واقعات اور حوادث ہوتے ہیں ان سب کا فاعل اللہ ہے، جہاں جہاں جو جو حرکتیں ہو رہی ہیں ان سب کا فاعل اللہ ہے، انسان ہو یا غیر انسان، جاندار ہو یا غیر جاندار، سب کی حرکت کا فاعل اللہ ہے، سورج ہو، یا چاند ہو، کہکشائیں ہوں، یا کوئی اور چیز ہو، ان سب حرکتوں کا کرنے والا اللہ ہے، سولار سسٹم کا چلانے والا اللہ ہے، جتنی کاریں چل رہی ہیں، جتنی کشتیاں چل رہی ہیں، جتنی مشینیں چل رہی ہیں، جتنی بسیں، ٹرین، راکٹ اور جہاز چل رہے ہیں ان سب کو چلانے والے اللہ ہیں، ان سب کی حرکت کے فاعل اللہ ہیں، مخلوق کے ہر ہر ذرہ کی حرکت کے فاعل اللہ ہیں، انسان کے ہر ہر ایکشن کے فاعل اللہ ہیں، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ" (الصافات:۹۶)

"تم کو اور تمہاری ان بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے"

مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک عام مسلمان توحیدِ ذاتی وصفاتی میں پختہ ہوتا ہے یعنی شرکِ ذاتی اور شرکِ صفاتی تو نہیں کرتا، لیکن افعال میں گڑبڑ کر جاتا ہے اسی وجہ سے وہ بار بار کہتے تھے کہ کرنے والی ذات اللہ کی ہے، یہ مولانا یوسف

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جملہ ہے، عام طور پر مسلمان یہیں گڑ بڑ کرتے ہیں، اس لئے دعوت و تبلیغ میں اس کی طرف زیادہ توجہ دلائی جاتی ہے کہ ہر فعل کی نسبت اللہ کی طرف کی جائے، اور اس کا یقین اور استحضار اپنے اندر پیدا کیا جائے، یہی توحیدِ افعالی ہے۔

خلق اور کسب میں فرق :

یہاں ایک بات یہ بھی غور کرنے کی ہے کہ فعل کی نسبت بظاہر بندہ کی طرف بھی کی جاتی ہے، اور اللہ کی طرف بھی، اس کو کہتے ہیں فعل ایک، نسبتیں دو، لیکن اس نسبت میں فرق ہوتا ہے، وہ یہ کہ اللہ کی طرف جو نسبت کی جاتی ہے وہ خلق کی اور بندہ کی طرف جو نسبت کی جاتی ہے وہ کسب کی، یعنی حاصل کرنے کی اور قبول کرنے کی، خالق کی طرف نسبت خلق کی کی جاتی ہے، اور بندہ کی طرف نسبت کسب کی کی جاتی ہے، یعنی ایک ہے فعل کا پیدا کرنا، اس کا نام خلقِ فعل ہے۔ اور یہ صرف اور صرف اللہ کا کام ہے، اور ایک ہے فعل کو کرنے کے لئے بندہ کا سارے اسباب ظاہر یہ اور ساری تدابیر کو اختیار کر لینا یہ کسبِ فعل ہے، اور بندہ کی طرف فعل کی نسبت اسی معنیٰ میں کی جاتی ہے، اسی وجہ سے اللہ پاک نے قرآن مجید میں خلق کی نسبت اپنی جانب کی ہے اور کسب کی نسبت انسان کی جانب کی ہے، کہیں بھی خلق کی نسبت انسان کی جانب نہیں کی گئی ہے۔

”وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهٗ إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ“ (الانعام:۱۲۰)

اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کیے کی عنقریب سزا ملے گی۔

”أُولٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ“ (یونس:۸)

”ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے“

اور خلق کی نسبت اپنی جانب کرتے ہوئے فرمایا:

"أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ" (النحل:۱۷)

"سو کیا جو شخص پیدا کرتا ہے وہ اس جیسا ہو جاوے گا جو پیدا نہیں کر سکتا۔ پھر کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے"

"وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ" (القصص:۶۹)

"اور آپ کا رب جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جس حکم کو چاہتا ہے) پسند کرتا ہے"

ایسی بے شمار مثالیں ہیں، جن میں اللہ پاک نے خلق کی نسبت اپنی جانب کی ہے، کسب کی نسبت بندہ کی جانب کی ہے۔ اور اسی کسب کی بنیاد پر بندوں کو جزا و سزا دی جاتی ہے۔ اس خلق اور کسب میں باریک سا فرق ہے، اس کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

غرض فعل کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اور ہر کام کو اس کے سپرد کرنا اور کام کو بنانے اور بگاڑنے والا اسی کو ماننا اور اس کا کامل یقین رکھنا توحیدِ افعالی ہے۔

فتحِ مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کے کلماتِ تشکر:

اسی وجہ سے نبی علیہ السلام نے فتحِ مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَه" (سننِ نسائی: کتاب القسامۃ، ۳۸۱۶)

"تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اور اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور تمام جماعتوں کو تنہا شکست دی" یعنی سب کچھ اللہ نے کیا، نہ میں نے کیا اور نہ میرے صحابہ نے کیا، سب اللہ نے کیا، کرنے والی ذات اسی کی ہے۔

مٹی آپ نے نہیں ہم نے پھینکی تھی:

اسی طرح بدر کے موقع جب آپ ﷺ نے کفار کی جانب مُٹھی بھر مٹی پھینکی تھی تو اللہ پاک نے اس کے بارے میں فرمایا:

"وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" (الانفال:۱۷)

"اور آپ نے مٹی نہیں پھینکی جب کہ آپ نے پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی"

اس میں آپ علیہ السلام کے فعل کی نفی کی گئی، جب کہ ظاہر میں فعل کا وجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوا تھا، لیکن اللہ پاک نے اس کی نسبت اپنی جانب کی اور فرمایا کہ وہ مٹی کفار کی جانب تم نے نہیں بلکہ ہم نے پھینکی تھی، اس کا فاعل میں ہوں، ان سب کے پیچھے میں کام کر رہا ہوں، میری فاعلیت کا استحضار کرو۔

حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعا:

اولیاء اللہ کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ قلب پر محنت کر کے فاعل حقیقی کی یاد قلب میں بٹھادیتے ہیں، اور اس کا استحضار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب ملفوظ ہے، ان کی دعا میں ہے: اَللّٰهُمَّ اُمْحُقْ فِعْلِيْ وَفِعْلَ الْفَاعِلِيْنَ فِيْ اَحَدِيَّةِ فِعْلِكَ، الخ اے اللہ تیرے فعل کی احدیت اور یکتائی میں میرے اور سارے فاعلوں کے فعل کو مٹادے، بس مجھے نظر یہ آئے کہ فعل ایک ہی کا ہو رہا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو توحیدِ افعالی کے حصول کی مبارک بادی:

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس خط میں ایک جملہ یہ لکھ کر بھیجا تھا کہ میرے پاس مادح اور ذام یا مدح اور ذم دونوں برابر ہو گئے، یعنی تعریف کرنے والے سے خوشی اور مذمت کرنے والے سے دلی تنگی نہیں ہوتی، تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو جواب لکھا، اور وہ بڑا عجیب جواب ہے، فرمایا کہ تمہیں توحیدِ افعالی مبارک ہو، اب تم پر توحیدِ افعالی کھل گئی ہے، اس لئے کہ مادح کی مدح اور ذام کی ذم اللہ کی طرف سے ہوتی ہے،

جب درمیان سے مخلوق ہٹ گئی، اور مخلوق سے عزت وذلت کا کانسپٹ ختم ہو گیا اور اپنی جانب سے بھی نظر ہٹ گئی اور صرف توجہ اللہ ہی کی طرف ہو گئی تو یہی توحیدِ افعالی ہے۔

توحیدِ آثاری:

توحید کی چوتھی قسم توحیدِ آثاری ہے، ساری کائنات آثار اللہ ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا: فَانْظُرْ إِلٰى آثَارِ رَحْمَتِ اللهِ (الروم: ۵۰) سو رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو۔

اللہ کے فعل سے اور اللہ کے خلق سے کائنات کا ظہور ہوا ہے، اس لئے یہ کائنات آثار اللہ کہلاتی ہے، جب اس کے خالق اللہ ہیں تو اس کے مالک بھی اللہ کو قرار دینا، اپنے سے اس کی ملکیت کی نفی کرنا توحید آثاری کہلاتی ہے، اثر فعل پر مرتب ہوتا ہے، فعل صفت کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے، اور صفت ذات سے متعلق ہوتی ہے۔ ان چار چیزوں میں اللہ ہی یاد رکھنا اور غیر اللہ سے نظر ہٹالینا توحیدِ اعتقادی کہلاتا ہے۔

عقیدۂ تقدیر بھی توحیدِ افعالی سکھاتا ہے:

ذاتِ الٰہ سے متعلق ہمیں اپنا یہ اعتقاد درست کرنا ہے، اور یہ استحضار پیدا کرنا ہے، اور یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، ہم سب ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا، کیونکہ ہماری ایکسرسائز نہیں ہوتی، ایمانِ مفصل میں "وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللهِ تَعَالٰى" کے ذریعہ اسی کی ترجمانی کی گئی ہے، اسی کا استحضار کروایا گیا ہے کہ فاعلِ حقیقی اللہ ہے، یہ جملہ تو ہم بچپن میں ترجمہ کے ساتھ یاد کر لیتے ہیں، لیکن اس کا شعور ہم کو نہیں ہے۔

آپ علیہ السلام کی حضرت حارثہ کے لئے عارف ہونے کی گواہی:

حضرت حارثہ بن مالک رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے، آپ نے ان سے پوچھا: كَيْفَ أَصْبَحْتَ يَا حَارِثَةُ بْنَ مَالِكٍ، حارث تمہاری صبح کیسے ہوئی؟

انہوں نے جواب دیا کہ: أَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا، میں نے سچے پکے مومن ہونے کی حالت میں صبح کی، تو آپ نے فرمایا:

اُنْظُرْ مَا تَقُوْلُ: إِنَّ لِكُلِّ قَوْلٍ حَقِيْقَةً فَمَا حَقِيْقَةُ ذٰلِكَ، ذرا غور کرو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیونکہ ہر بات کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہاری بات کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کہنے لگے: عَزَفْتُ نَفْسِي عَنِ الدُّنْيَا فَأَسْهَرْتُ لَيْلِي وَأَظْمَأْتُ نَهَارِيْ وَلكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى عَرْشِ رَبِّي قَدْ أُبْرِزَ لِلْحِسَابِ، وَكَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَزَاوَرُوْنَ فِي الْجَنَّةِ، وَكَأَنِّيْ أَسْمَعُ عُوَاءَ أَهْلِ النَّارِ۔

فرمایا کہ میں نے دنیا سے اپنے نفس کو نکال دیا، کتنا بڑا جملہ ارشاد فرمایا! یعنی ماسوی اللہ سے کوئی قلبی تعلق نہیں رہا، پس میں راتوں میں جاگ کر عبادت کرتا ہوں، اور دن میں (بھوکا) پیاسا رہتا ہوں یعنی روزہ رکھتا ہوں، اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے رب کے عرش کو دیکھ رہا ہوں جو حساب کے لئے ظاہر کیا گیا ہے، اور گویا کہ میں جنتیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپس میں ملاقات کر رہے ہیں اور جہنمیوں کی چیخ وپکار کو بھی سن رہا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”عَبْدٌ نَوَّرَ الْإِيْمَانُ فِيْ قَلْبِهٖ، إِذْ عَرَفْتَ فَالْزَمْ“۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: باب في الزهد و قصر الأمل، ۱۰۵۹۰ و ۳۱۰۶۴)

یہ بندہ ایسا ہے کہ اللہ نے اس کے دل کو ایمان سے منور کر دیا ہے، اے حارث! تو عارف ہو گیا، جب تو عارف ہو گیا تو اب اس کو تھام کر رکھ، اور اس کو لازم پکڑ لے۔

اللہ کو دل میں لانے کے لئے غیر اللہ کو نکالنا پڑے گا:

میرے دوستو! اللہ پاک ہمارے دل میں ایسے ہی نہیں آتے، پہلے دل کو ان گندگیوں سے پاک کرنا ہو گا، ماسوی اللہ سے دل کو خالی کرنا ہو گا، تب جا کر اللہ ہمارے دل میں آئے گا، مخلوق سے تعلق کو ختم کرنا ہو گا، پھر خالق دل میں آئے گا، مملوک سے تعلق کو

ختم کرنا ہو گا، تب مالک دل میں آئے گا، مربوب سے تعلق کو ختم کرنا ہو گا، تب رب دل میں آئے گا، کیونکہ اللہ نے دل اپنے لئے بنایا ہے، اور اس کے اندر ایک ہی چیز کو قبول کرنے کی سکت ہے، یا تو اللہ، یا ماسوی اللہ، اگر ماسوی اللہ دل میں آئے گا تو اللہ پاک نہیں آئیں گے، کیونکہ اللہ پاک ہیں، اور پاکی کو پسند کرتے ہیں، اور ماسوی اللہ سراپا گندگی ہے، تو جب تک گندگی دل میں موجود رہے گی تب تک پاک ذات اس میں نہیں آسکتی، اس لئے اگر اللہ کو دل میں سمانا ہے تو دل سے غیر اللہ کو نکالنا ہو گا۔

اس موقع پر خواجہ صاحب کا شعر یاد آگیا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

دل کو ان ساری گندگیوں سے پاک کرنا پڑے گا، تب جا کر معرفت حاصل ہو گی، اب بتاؤ دوستو: کہ جن صحابی کو نبی نے عارف کہا ہے ان کا دل کیسا ہو گا؟ ان میں حرص اور کبر کہاں ہو گا؟ ان میں خود پسندی کہاں ہو گی؟ ان میں بخل کہاں ہو گا؟ ان میں بزدلی کہاں ہو گی؟ ان میں بے حیائی کہاں ہو گی؟ ان میں بے مروتی کہاں ہو گی؟ ان میں بے صبری کہاں ہو گی؟ ان میں ناشکری کہاں ہو گی؟ جب نفس ان ساری گندگیوں سے پاک ہو گا، تو رب دل میں آئے گا، اللہ کا قرب نصیب ہو گا، ایمان میں کمال پیدا ہو گا۔

قربِ الٰہی کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں:

اس کے لئے آدمی کا عالم ہونا ضروری نہیں، شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ جاہل اور گنوار سب کے لئے اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، حصولِ درجات اور حصولِ قرب سب کے لئے آسان ہے، اور یہ انسان ہونے اور مسلمان ہونے کا شرف ہے۔

اللہ کا استحضار پیدا کریں:

بس اللہ کا استحضار کر کے اپنی زندگی کو سنوارنا ہے، ہمیں تو کسی بھی چیز میں یہ یاد نہیں رہتا کہ اللہ ہماری ہر حرکت دیکھ رہا ہے، اللہ ہماری ہر آواز سن رہا ہے، اللہ کو ہمارے ہر عمل کا علم ہے، وہ ہم سے قریب ہے، وہ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہم کو محیط ہے، جگہ جگہ قرآن مجید میں اللہ پاک نے ہم کو یاد دلایا اور سمجھایا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن پھر بھی اس کا شعور اور احساس ہم کو نہیں ہے۔

"وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ" (الحدید:۴)

اور وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہوں اور وہ تمہارے سب اعمال کو بھی دیکھتا ہے۔

"أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَجْوٰى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوْا" (المجادلة:۷)

کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو. اور نہ اس (عدد) سے کم (میں) ہوتی ہے (جیسے دو یا چار آدمیوں میں) اور نہ اس سے زیادہ مگر وہ (ہر حالت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ لوگ کہیں بھی ہوں۔ خلوت میں ہو یا جلوت میں۔ ایسے ہی فرمایا: "فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ" (محمد:۱۹)

”آپ اس کا یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں، اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیئے، اور سب مسلمان مَردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی اور اللہ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی خبر رکھتا ہے“

کہاں کہاں تم جارہے ہو، اور کب واپس آرہے ہو وہاں کتنا رہ رہے ہو، بازار میں ہو، یا آفس میں، گھر میں ہو یا سفر میں، سب کچھ اللہ جانتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تم کسی بھی مقام میں ہو، اس کلمہ کے تقاضے کے مطابق تمہاری زندگی ہے یا نہیں، اور وہ تمہیں یاد ہے یا نہیں وہ جانتے ہیں، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کلمہ پڑھنے والے کی ساری زندگی چاہے وہ مسجد میں ہو یا گھر میں، بیوی بچوں میں ہو یا کسی اور کے ساتھ اللہ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیئے، اس کا ہر ایکشن اور اس کی ہر حرکت اس کی رضا کے مطابق ہونی چاہیئے۔

اللہ کے استحضار کا ایک واقعہ:

اس کے علاوہ بے شمار آیات میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے قریب ہونے کو بتایا ہے، اپنے ساتھ ہونے کو بتایا ہے، اپنے جاننے کو بتایا ہے، اپنے دیکھنے کو بتایا ہے۔ تاکہ بندے جو بھی عمل کریں تو سوچ سمجھ کر کریں، رب کی مرضی کے مطابق کریں، اس کی نافرمانی سے بچیں۔ جب اللہ کے قریب و اقرب ہونے کا، سمیع و بصیر ہونے کا، محیط و شہید ہونے کا استحضار پیدا ہوتا ہے گا تو پھر بندہ کا عمل صحیح ہوتا ہے، خلوتیں اور جلوتیں صحیح ہوتی ہیں، عبادات اور معاملات صحیح ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا، اور ان کا مرید ہو کر ان کے ساتھ رہنے لگا، وہ بزرگ دوسرے مریدین کے مقابلہ میں اس کو زیادہ چاہنے لگے، اس کی وجہ سے جو مریدین پہلے رہتے تھے ان کو حسد ہونے لگا کہ صرف چند ہی دن میں حضرت اس کو چاہنے لگے، اور ہم پر اس کو ترجیح دینے لگے، شیخ تک یہ بات پہنچی، شیخ نے ارادہ کیا کہ ان

سب کا امتحان لیا جائے، اور بتایا جائے کہ میں اس کو زیادہ کیوں چاہتا ہوں؟ سب کو جمع کیا اور سب کو ایک چاقو اور ایک مرغی دی اور کہا کہ اس کو ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو، کسی نے جنگل لے جا کر ذبح کیا، تو کسی نے دیوار کے پیچھے ذبح کی، سب نے اپنے اعتبار سے مرغی ذبح کی، اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گئے، لیکن اس نئے مرید نے مرغی ذبح ہی نہیں کی، اور اس کو زندہ واپس لا لیا، بزرگ نے سب سے پوچھا تو سب نے اپنی ذبح کی ہوئی جگہ بتائی، اور کہنے لگے کہ ہم نے فلاں فلاں جگہ مرغی ذبح کی، ہمیں وہاں کسی نے نہیں دیکھا، بزرگ نے اس نئے مرید سے پوچھا کہ تم نے کیوں ہمارا حکم پورا نہیں کیا؟ تو مرید کہنے لگا کہ حضرت! آپ نے کہا تھا کہ اس کو ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو، لیکن جہاں بھی میں جاتا تو میرے ذہن میں یہی بات ہوتی تھی کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے، اس لئے میں نے ذبح نہیں کیا، آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی نہ دیکھ رہا ہو بس جہاں میں گیا، دن میں یا رات میں، جنگل میں یا شہر میں، دیوار کے پیچھے یا سامنے، مجھے کوئی ایسی جگہ نہ مل سکی جہاں مجھے اللہ نہ دیکھ رہا ہو، اسی لئے میں زندہ مرغی لے آیا، تب ان بزرگ نے دیگر مریدین سے کہا کہ میں اس کو جو چاہتا ہوں وہ اسی وجہ سے کہ اس کو اللہ کا استحضار اور دھیان بہت زیادہ ہے، بس میں یہی دکھانا چاہ رہا تھا، یہ تو سوکھی ہوئی لکڑی تھی آگ دکھاتے ہی آگ پکڑ لی، تم کچی لکڑی ہو، دھواں ہی دھواں نکلتا جا رہا ہے، لیکن آگ تم میں لگ نہیں رہی ہے۔

استحضارِ الٰہ کیلئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے:

اب سوال یہ ہے کہ یہ استحضار کیسے پیدا کیا جائے؟ تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنا مشیر بنایا جائے، کسی کو اپنے ایمان اور اعمال کا نگران بنایا جائے، کسی کو اپنا دینی سرپرست اور رہنما بنایا جائے، اور اپنی حالت ان کے سامنے رکھ کر ان سے مشورہ کر کے

ان کی رہنمائی کے مطابق عمل کیا جائے، کیونکہ اگر کوئی سرپرست نہ ہو، نگران اور ذمہ دار نہ ہو تو فتنہ اور گمراہ ہونے کا اندیشہ بہت زیادہ ہوتا ہے، ایسی کئی مثالیں ہیں کہ بڑے بڑے لوگ صرف اپنا رہنما اور سرپرست اور مشیر نہ ہونے کی وجہ سے گمراہ ہوگئے، اور فتنہ برپا کر دیا، جتنا بڑا عالم ہوا اتنا ہی بڑا اس کا فتنہ بھی ہوا، فتنوں کے بانی ایسے ہی لوگ ہوئے ہیں، کیا ان کے پاس علم نہیں تھا؟ محنت نہیں تھی؟ سب کچھ تھا، علم بھی تھا محنت بھی تھی، استعداد بھی تھی، لیکن ان کے ایمان اور اعمال کا نگران نہیں تھا، اس لئے ان کا نگران شیطان بن گیا، اور شیطان کے پاس علم کی کمی نہیں ہے، اس سے مقابلہ کرنا مشکل ہے، اس کو پتہ ہے کہ کس پر کس قسم کا وار کرنا ہے، عالم کو کیسے پھسلایا جاسکتا ہے؟ عامی کو کیسے جال میں پھنسایا جاسکتا ہے؟ داعی کو کیسے گمراہ کیا جاسکتا ہے؟ اس لئے ہر آدمی کو وہ اسی اعتبار سے گمراہ کرنے کا ماہر ہے، داعی کو دعوت کی لائن سے پھسلائے گا، عالم کو علم کی لائن سے گمراہ کرے گا، بزنس مین کو بزنس کی لائن سے تباہ و برباد کرے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے ایمان کا کوئی نگران ہو، ہمارے اعمال کا کوئی نگران ہو، ہماری نیتوں اور اخلاص کا کوئی نگران ہو، ہماری توحید اور شرک کا کوئی نگران ہو، ورنہ آدمی شرک کو بھی توحید سمجھ بیٹھے گا۔

توحید بھی اور شرک بھی:

قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا:

"وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ" (یوسف:۱۰۶)

"اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں"

یہ آیت جب میری نظر سے گزرتی ہے تو حیرت میں پڑ جاتا ہوں کہ بہت سے لوگ

ایمان کے باوجود بھی شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ ایمان کے بعد شرک میں مبتلا ہونے کی صورت یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور اس کی دیگر صفات میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا جائے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ریاکاری بھی اسی میں داخل ہے، کیونکہ احادیث میں نبی علیہ السلام نے اس کو شرک اصغر قرار دیا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟

اے اللہ کے رسول! شرک اصغر کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

"اَلرِّيَاءُ" شرک اصغر ریا ہے۔

ایسے ہی غیر شرعی جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے، یا غیر اللہ پر یقین اور اعتماد کے ساتھ عملیات کروانا بھی شرک میں داخل ہے۔

"اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ" (تفسیر ابن کثیر: ۴/۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰)

بے شک منتر، تعویذ، ٹوٹکے شرک ہے، یعنی جب اس میں غیر اللہ سے مدد حاصل کی جائے اور غیر اللہ کا اعتقاد رکھا جائے تو شرک ہے، ورنہ اللہ پر اعتقاد رکھ کر اللہ ہی سے مدد مانگتے ہوئے تعویذ وغیرہ کی جائے تو جائز ہے، بلکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

غرض بزرگوں اور اولیاء اللہ کے پاس سب سے زیادہ محنت اسی چیز پر کی جاتی ہے کہ اللہ کی ذات کا یقین دل میں بیٹھ جائے، اس کی خالقیت، اس کی مالکیت، اس کی حاکمیت، اس کی ربوبیت اور اس کی معبودیت کا یقین دل میں بیٹھ جائے، اور اس کا استحضار پیدا ہو جائے، اس لئے اپنے آپ کو بچانے کیلئے نیک، متقی، متبعِ سنت اہلِ حق میں سے کسی صاحبِ نسبت آدمی سے اپنا تعلق قائم کرنا اور ان کی نگرانی اور رہنمائی میں چلنا بہت اہم اور ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

❊ ❊ ❊

عقیدۂ رسالت اور اس کے تقاضے

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ”یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ، وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکَافِرِیْنَ“ (المائدۃ:۶۷)

”اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (سب) پہنچا دیجیے، اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا، یقیناً اللہ تعالیٰ ان کافروں کو راہ نہ دیں گے“

وَقَالَ فِیْ مَوْضِعٍ اٰخَرَ: ”لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیَاتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ“ (اٰلِ عمران:۱۶۴)

”حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں

اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے"

رسالت پر ایمان جزءِ ایمان ہے:

برادرانِ اسلام! اللہ پاک نے اس دنیا میں نبی علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ کو دینِ اسلام دے کر مبعوث فرمایا، جس پر ایمان رکھنا سب کے لئے ضروری ہے، اور اسی میں اپنی کامیابی کو منحصر سمجھنا اور اس پر عمل کو لازم سمجھنا بھی ضروری ہے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے ایسے ہی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اور آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی نہ مسلمان ہوتا ہے، اور نہ نجات پاتا ہے، یہ ایک بنیادی عقیدہ ہے، جب تک "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کے ساتھ "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللہ" کا عقیدہ نہیں رکھا جائے گا اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہو سکتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو اور آپ کے ساتھ جتنے رسولوں کو بھیجا ہے وہ سب حق ہیں، اللہ کے پیغامات بندوں تک پہنچانے والے ہیں، اور ان پیغامات کے پہچانے میں وہ کوئی خیانت نہیں کرتے، جو پیغام اور احکام وہ لے کر آئے وہ برحق ہیں، اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، اور اسی میں ہماری کامیابی ہے، اور نہ ماننے میں ہماری ناکامی اور گمراہی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے سزا ہے۔ اس ایک عقیدہ میں پھر کئی عقائد شامل ہیں، جن کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آپ کے سامنے ذکر کی جائے گی۔

موجودہ زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ صرف اللہ پر ایمان کافی ہے، چاہے وہ رسول پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، لیکن قرآن وحدیث سے ثابت یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" پڑھنے والے کی نجات نہیں ہوگی، بلکہ "مُحَمَّدٌ

رَسُوْلُ اللہ" بھی ضروری ہے، اس لئے جب تک کوئی "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللہ" نہ پڑھے، اور آپ ﷺ پر ایمان نہ لائے اس وقت تک وہ آدمی نہ مومن ہے اور نہ مسلم ہے، بلکہ وہ کافر اور مخلد فی النار ہے۔

عقیدۂ رسالت میں سارے رسول داخل ہیں:

ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں جہاں رسالت کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں عموماً رسول کو جمع کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے، اس میں دراصل یہ بتانا ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنے رسول اللہ نے بھیجے ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے، چاہے ہم انہیں جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، جتنے انبیاء کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے ان کو ان کے ناموں کے ساتھ اور ان کی تعلیمات کے ساتھ اور جن انبیاء کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ہے ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے، کسی بھی رسول کا انکار کرنا اللہ کو جھوٹا کہنا ہے، اگر کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یا کسی اور نبی کو ماننے سے انکار کردے تو وہ مسلمان نہیں رہے گا، کیونکہ قرآن وحدیث میں ان کا رسول ہونا بتایا گیا، اس لئے ان کی رسالت پر ایمان ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی تشریف آوری کے بعد ان کی شریعت منسوخ ہوگئی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ سارے نبیوں کو اللہ نے بھیجا ہے، اور ان کی رسالت کو ماننے کا حکم دیا ہے، اور جتنے انبیاء کرام گزرے ہیں ان سے بھی اللہ نے حضرت محمد ﷺ پر ایمان کا عہد لیا ہے، اور جب آپ آئے تو آپ نے ان کی تصدیق کی، اور قرآن میں اس کا ذکر کیا گیا، اس لئے ہمارا ایمان بھی ان پر ایمان لانے پر موقوف رہے گا۔

"وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ قَالُوْا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا

وَأَنَامَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ" (آل عمران: ۸۱)

اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آوے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ وہ بولے ہم نے اقرار کیا! ارشاد فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں"

جب انبیاء سے اس کا عہد لیا گیا تو امتیں خود بخود اس میں شامل ہو گئیں، اس لئے جتنے رسول اللہ نے بھیجے ہیں ان سب پر ایمان ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ اگر ہم ایک نبی کو مانیں اور ایک نبی کو نہ مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کو سچا قرار دے رہے ہیں اور ایک کے بارے میں نعوذ باللہ جھوٹا قرار دے رہے ہیں۔ اس لئے سب پر ایمان ضروری ہے۔

انبیاء پر ایمان کی دو صورتیں:

البتہ ان پر ایمان کی دو صورتیں ہیں، چونکہ کچھ پیغمبروں کے حالات تفصیلاً مذکور ہیں، اور کچھ کے اجمالاً، کچھ کا تذکرہ قرآن وحدیث میں ہے اور کچھ کا نہیں، تو جن کا تفصیلاً ذکر ہے ان پر تفصیلاً ایمان لانا ضروری ہے، جیسے قرآن مجید میں پچیس انبیاء کرام اور رسولوں کے نام اور ان کے کچھ حالات ہیں، اُن پچیس انبیاء پر ان کے ناموں کے ساتھ اور ان تفصیلات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اُن کے علاوہ انبیاء پر جن کا اجمالاً ذکر ہے یا جن کا ذکر ہی نہیں ہے ان پر اجمالا ایمان لانا ضروری ہے کہ جتنے انبیاء اور رسول اللہ نے دنیا میں بھیجے ہیں ہم ان سب پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سچے اور برحق نبی تھے، اور اللہ کے احکامات بندوں تک پہنچاتے تھے۔

انبیاء اور رسل کی تعداد:

اب یہ رسول کتنے تھے؟ کیا ان کی کوئی خاص تعداد ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں، البتہ بعض احادیث میں تعداد کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ قطعی نہیں ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے پوچھا:

"یَا رَسُولَ اللّٰہِ! کَمِ النَّبِیُّوْنَ؟۔ اے اللہ کے رسول کتنے نبی بھیجے گئے؟

قَالَ: "مِائَۃُ أَلْفٍ وَأَرْبَعَۃٌ وَعِشْرُوْنَ أَلْفَ نَبِیٍّ"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے گئے! میں نے پوچھا: کَمِ الْمُرْسَلُوْنَ مِنْھُمْ؟ ان میں سے کتنے رسول تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ثَلَاثُ مِائَۃٍ وَثَلَاثَۃَ عَشَرَ" "تین سو تیرہ" (المستدرک علی الصحیحین: کتاب تواریخ المتقدمین من الأنبیاء والمرسلین، ۴۱۶۶)

عقائد کے ثبوت کے لئے روایات کا معیار:

لیکن چونکہ یہ مقدار قطعی نہیں ہے اس لئے عقائد میں خاص تعداد شامل نہیں، کیونکہ عقیدہ کے لئے خبر متواتر کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ اس سے قطعیت ثابت ہوتی ہے، اخبارِ آحاد سے قطعیت ثابت نہیں ہوتی، اس لئے ان احادیث کو ماننا تو ضروری ہوتا ہے لیکن ان سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ مقدار بھی خبر واحد سے ثابت ہے اور پھر حدیث کے صحت وضعف کا بھی مسئلہ ہے، اس لئے یہ مقدار عقائد میں داخل نہیں ہے۔

باوجودیکہ خبرِ واحد حدیث ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہوتا ہے، مگر چونکہ وہ ایک ہی راوی سے مروی ہوتی ہے اس لئے اس میں غلطی کا، بھول چوک کا، کمی زیادتی کا، سہو کا امکان ہوتا ہے، اس امکان کی وجہ سے اس میں قطعیت نہیں رہتی، یا کبھی اس طرح کی احادیث میں تعارض ہو جاتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے کہ بعض روایات میں نبی علیہ السلام نے ایک

کے بجائے دولاکھ کا ذکر کیا ہے، جب اس طرح کا احتمال پیدا ہو جائے تو اس میں قطعیت نہیں رہتی، اس لئے اس کو عقیدہ کی بنیاد بھی نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ عقیدہ کے معنیٰ میں ہی قطعیت کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس لئے اگر یہ قطعی نہ ہوں تو وہ عقیدہ کیا رہا؟ یہ تو ایک خیال اور وہم ہو گیا۔

اس لئے سارے اسلامی عقیدے بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں، ان میں کسی قسم کا شک نہیں ہوتا، تردد نہیں ہوتا، اور ہمارے اور غیر مسلموں کے عقیدوں میں ایک بنیادی فرق یہی ہے کہ ہمارے عقائد قطعی ہوتے ہیں، اور ان کے عقائد ظنی اور وہمی ہوتے ہیں، ان کا عقیدہ صرف مفروضہ ہوتا ہے، کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا۔

اُن کے پاس رزق کا ذمہ دار ایک خدا ہے، وہ بھی مفروضہ ہے، موت وحیات کا ذمہ دار الگ خدا ہے، وہ بھی مفروضہ ہے، کاروبار کا ذمہ دار خدا بھی مفروضہ ہے، اولاد کا جو ذمہ دار ہے وہ بھی مفروضہ ہے، پانی کا جو ذمہ دار ہے وہ بھی مفروضہ ہے، جتنے بھی خدا اُن لوگوں نے بنائے ہیں وہ سب کے سب فرض کئے ہوئے ہیں، دلیل کسی کے پاس نہیں، اور ان کے مقابلہ میں اسلامی عقائد بہت ہی واضح، قطعی، یقینی ٹھوس اور مضبوط ہیں۔

کیا بدھا سے مراد حضرت ذوالکفل ہیں؟

جیسے ایک زمانے میں یہ مسئلہ چلا تھا کہ بدھ مت کے پیروکار بدھا کے بارے میں یہ گمان کرنے لگے تھے کہ شاید وہ پیغمبر ہو، لیکن اُن کے پیغمبر ہونے کی اُن کے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، اُن کے حالات میں لکھا ہے کہ شاید وہ ذوالکفل ہیں، اور اُن کے حالات میں لکھا ہے کہ اُن کو کھانا پانی ایک ہی ساتھ آتا تھا، اور ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ناریل کے درختوں کے بیچ میں رہتے تھے۔ لیکن یہ سب بالکل غیر یقینی اور وہمی باتیں ہیں، اس کے علاوہ نبی ہونے کے لئے محض یہ باتیں کافی بھی نہیں ہیں،

حضرت ذوالکفل کو ہم مانتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر تھے، قرآن پاک میں ان کا ذکر ہے۔(الانبیاء:۸۵) مگر ذوالکفل کا مصداق کون ہے؟ بدھا ہے یا غیر بدھا؟ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے۔ اس لئے ہم ان کو نبی نہیں مان سکتے، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایسے ہی اگر کسی غیر نبی جیسے رام کے بارے میں لوگ کہتے ہیں، یا کرشن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں یا گنیش کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی پیغمبر تھے، تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ پیغمبر تھے؟ نبی تو بہت سارے آئے، ان پر ہمارا ایمان ہے، لیکن یہ نبی تھے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں اس لئے ہم ان کو نبی نہیں مان سکتے۔

بہر حال یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ سارے انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے، جن کا ذکر تفصیلاً ہے ان پر تفصیلا اور جن کا ذکر اجمالاً ہے ان پر اجمالا ایمان لانا ضروری ہے۔

سابقہ شریعتوں کا نسخ حضور ﷺ پر ایمان بالرسالت کا جزء ہے:

لیکن ان کو نبی اور رسول ماننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ اب ان کی شریعت منسوخ ہو چکی ہے، جیسے اللہ کے بارے میں ایک ہونے کا اعتقاد ہوتا ہے کہ اللہ ہی لائقِ عبادت ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ایسے ہی جب آپ ﷺ کو نبی مان لیں تو اب بقیہ کی نفی کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اب آپ ہی کی رسالت چلے گی اور آپ کے لائے ہوئے احکام ہی چلیں گے، اور انہیں کی اتباع کی جائے گی، کسی اور نبی کی اطاعت اور اتباع اب نہیں کی جائے گی۔ آپ کی آمد کے بعد کسی اور مذہب پر عمل کرنا تو دور کی بات ہے، اس کی طرف میلان بھی اسلام میں گوارا نہیں، اب اگر کوئی آپ کی اطاعت چھوڑ کر ان ادیانِ سابقہ پر چلے گا اگرچہ وہ آسمانی کتاب اور آسمانی مذہب کو مان رہا ہے اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ مذہب پر چل رہا ہے لیکن پھر بھی وہ کافر

ہو گا، اسلام کے علاوہ کوئی مذہب والا چاہے وہ آسمانی ہی کیوں نہ ہو اگر وہ نجات چاہتا ہو تو اس کو اسلام قبول کرنا پڑیگا، اور آپ ﷺ کی رسالت کو ماننا پڑے گا، اور اس پر چلنا پڑے گا۔

سابقہ شریعتیں منسوخ کیوں؟

اب سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کے آنے کے بعد ان کی شریعت اوران کے احکام کیوں منسوخ ہوگئے؟ اب ان کی اتباع کیوں نہیں کی جائے گی؟ تو اس کا جواب ایک اور عقیدہ پر مبنی ہے، وہ عقیدہ یہ ہے کہ آپ سارے انبیاء سے افضل ہیں، آپ سارے انبیاء کے امام ہیں، آپ سارے انبیاء کے سردار ہیں۔ جب آپ سب کے امام، سب کے سردار اور سب سے افضل ہیں تو افضل کے ہوتے ہوئے غیر افضل کی کیسے اتباع کی جائے گی؟ سردار کے ہوتے ہوئے غیر سردار کی اتباع کیسے کی جائے گی؟ امام کے ہوتے ہوئے غیر امام کی اتباع کیوں کی جائے گی؟ اس لئے آپ کے آنے کے بعد سب کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔

آپ ﷺ کی افضلیت کے چند دلائل:

حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ إِلَّا تَحْتَ لِوَائِيْ" (سنن ترمذی: کتاب المناقب، ۳۶۱۵ وصحیح بخاری: کتاب التفسیر: ۴۷۱۲)

میں آدم کی اولاد کا قیامت کے دن سردار رہوں گا، اور مجھے کوئی فخر نہیں ہے، اور میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہو گا، اور اس دن کوئی نبی نہیں ہوں گے آدم ہو یا ان کے علاوہ کوئی اور مگر یہ کہ وہ میرے جھنڈے کے نیچے رہیں گے۔

یہاں ایک نکتہ غور کرنے کا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اولادِ آدم کا سردار ہوں، یہ نہیں کہا کہ میں آدم کا بھی سردار ہوں، اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ آپ نے ادباً ایسا فرمایا ہے، ورنہ اس کے بعد کے جملہ میں آپ ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اس میں شریک کرلیا اور فرمایا: ''آدم فمن سواہ'' کہ آدم اور ان کے علاوہ جتنے بھی نبی ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، پہلے ادب اور تواضع کے طور پر ''سیّد ولد آدم''، فرمادیا، بعد میں حضرت آدم کو بھی شامل فرمالیا۔ غرض اس حدیث سے آپ ﷺ کی سارے انبیاء پر افضلیت اور سرداری ثابت ہوتی ہے۔

ایسے ہی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''اَنَا حَبِیْبُ اللّٰہِ، وَلَا فَخْرَ، وَاَنَا حَامِلُ لِوَاءِ الْحَمْدِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ تَحْتَہٗ آدَمُ فَمَنْ دُوْنَہٗ وَلَا فَخْرَ، وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ، وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا فَخْرَ، وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ یُّحَرِّکُ حَلَقَ الْجَنَّۃِ، فَیَفْتَحُ اللّٰہُ لِیْ فَیُدْخِلُنِیْھَا، وَمَعِیَ فُقَرَاءُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلَا فَخْرَ، وَاَنَا اَکْرَمُ الْاَوَّلِیْنَ وَالْآخِرِیْنَ عَلَی اللّٰہِ وَلَا فَخْرَ'' (شرح السنۃ للبغوی: کتاب الاستئذان: باب تحریم العب بالنرد، ۳۶۲۵)

میں اللہ کا حبیب ہوں، اور میں اس پر کوئی فخر نہیں کرتا، قیامت میں لواءِ حمد میرے ہاتھ میں ہوگا، آدم اور ان کے علاوہ سب اس کے نیچے ہوں گے، میں اس پر فخر نہیں کرتا، میں سب سے پہلا شافع ہوں اور قیامت میں سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی، اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، سب سے پہلے جنت کا حلقہ میں کھٹکھٹاؤں گا، اور اللہ تعالی میرے لئے اسے کھولیں گے، اور مجھے اس میں داخل کریں گے، اور میرے ساتھ فقراءِ مومنین ہوں گے، اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، میں اللہ کے ہاں اولین اور آخرین میں سب سے زیادہ معزز اور مقام و مرتبہ والا ہوں۔ مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔ اس حدیث سے آپ کی افضلیت کی کئی وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے انبیاء کی امامت کی، اور امام اسی کو بنایا جاتا ہے جو سب سے افضل ہوتا ہے، اسی وجہ سے نبی کی موجودگی میں غیر نبی امامت نہیں کر سکتا۔ اس سے آپ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی باتوں اور کاموں کی معافی اعلان فرمایا، جو صرف آپ کی خصوصیت ہے، ''لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ'' (الفتح: ۲) ، اس سے بھی آپ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

آپ کی بعثت کی عمومیت آپ کی افضلیت ثابت کرتی ہے، آپ کا خاتم النبیین ہونا آپ کی افضلیت ثابت کرتا ہے، آپ پر دین کو مکمل کر دینا اور ''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ'' کا مژدہ سنانا آپ کی افضلیت کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی دلیلیں ہیں جن سے آپ ﷺ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے، علماء نے کم و بیش سو (۱۰۰) دلائل آپ کی افضلیت پر بیان کئے ہیں۔

اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ افضل الرسل اور افضل الانبیاء یعنی سارے رسولوں اور سارے نبیوں میں افضل ہیں۔

لہذا جب آپ افضل اور اکمل ہیں تو آپ کی شریعت بھی سب سے افضل اور اکمل ہوگی، اور جب آپ کی شریعت سب سے افضل اور اکمل ہوگی تو غیر افضل کی اتباع کیسے کی جائے گی۔ اس لئے آپ کی شریعت کے ہوتے ہوئے کسی اور شریعت کی اتباع کی گنجائش ہی نہیں۔

عقیدۂ افضلیتِ انبیاء:

یہاں یہ فرق ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک عقیدہ انبیاء اور رسولوں کے مابین افضلیت کا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت بخشی ہے، کچھ رسولوں

کو کچھ سے افضل بنایا ہے، اور ان میں سب سے افضل آپ کو بنایا ہے، اس کی کچھ تفصیل اوپر آچکی ہے، اور دوسرا عقیدہ رسولوں پر ایمان لانے کا ہے، دونوں الگ الگ عقیدے ہیں، جہاں تک رسولوں پر ایمان لانے کا مسئلہ ہے تو سارے انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں تفریق جائز نہیں ہے، قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا:

"قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا أُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ" (البقرۃ:۱۳۶)

(مسلمانو) کہدو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور (ان کی) اولاد کی طرف بھیجا گیا اور (اس حکم و معجزہ پر بھی) جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اس (اللہ تعالیٰ) کے مطیع ہیں۔ اور ایک جگہ پر ہے:

"آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" (البقرۃ:۲۸۵)

اعتقاد رکھتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز پر جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مؤمنین بھی، سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر کہ ہم اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

اس لئے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نفس ایمان بغیر تفریق کے سب پر ضروری ہے، لیکن درجات میں تفریق ہے۔ اور یہ خود اللہ نے بتایا ہے:

"تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ کَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ" (البقرۃ:۲۵۳)

"یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں سے سرفراز کیا"

اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے مختلف درجات ہیں، کچھ نبیوں اور رسولوں کو اللہ تعالیٰ نے کچھ کے مقابلہ میں فضیلت بخشی ہے۔ اور ان میں سب سے افضل آپ کو بنایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے اظہار میں بھی اعتدال ضروری ہے:

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے عقیدے میں بھی اعتدال ضروری ہے، اس میں حد سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے، حد سے تجاوز کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ کو بندہ سے خدا بنادیا جائے، یہ جائز نہیں ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کی افضلیت اس اعتبار سے بیان کی جائے کہ اس میں دوسرے انبیاء کی توہین ہو، ان کی شان میں گستاخی ہو، یا ان کی تنقیص ہو، اور ان کو کمتر ظاہر کیا جائے تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔

سب کامل ہیں، سب اکمل ہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ترین ہیں، سب افضل ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم افضل ترین ہیں۔ لیکن اس کو اس انداز میں نہیں بیان کرنا چاہئے کہ دوسرے انبیاء کی توہین ہو جائے۔ اگرچہ کسی کی توہین کا ارادہ نہ ہو، لیکن تعبیر بھی ایسی نہیں ہونی چاہیئے کہ ان کی توہین ہو، کہیں لوگ بد تہذیبی سے ایسا کر گزرتے ہیں، اور کہیں تہذیب کے ساتھ کر گزرتے ہیں، دونوں صحیح نہیں ہے۔

کیا ایک شخص کی افضلیت بیان کرنے کے لیے اُس کے بھائی کی تنقیص یا اس کی بے عزتی یا اس کی تحقیر کرنا جائز ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! یہ طریقہ افضلیت بیان کرنے کا نہیں ہے

کہ جس کی افضلیت آپ بیان کررہے ہیں وہ خود اس کو بھی اور دوسرے کو بھی ناگوار گزرے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں، سب معصوم ہوتے ہیں، گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، اوصافِ حمیدہ کے حامل ہوتے ہیں، سب امتیوں سے نیک ہوتے ہیں، ایک جان دو قالب کی طرح ہوتے ہیں، اس لئے اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں ان کی شان میں گستاخی اور بے ادبی نہ ہو جائے۔

افضلیتِ انبیاء سے متعلق ایک صحابی اور یہودی کا واقعہ:

اس طرح کا ایک واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا، ایک صحابی اور یہودی میں جھگڑا ہو گیا، یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سب سے افضل قرار دے رہا تھا، صحابی کو غصہ آگیا، انہوں نے یہودی کو طمانچہ مارا، یہودی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے صحابی کو بلایا اور کہا:

"لِمَ لَطَمْتَ وَجْهَهٗ" تم نے اس کو طمانچہ کیوں مارا؟ وہ کہنے لگے کہ واقعہ ایسا ہوا، اس لئے میں نے ان کو مارا! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تُخَيِّرُوْنِيْ مِنْ بَيْنِ الْأَنْبِيَاءِ، فَإِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُوْنُ أَوَّلَ مَنْ يُفِيْقُ، فَإِذَا أَنَا بِمُوْسَى آخِذٌ بِقَائِمَةٍ مِنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ، فَلَا أَدْرِيْ أَفَاقَ قَبْلِيْ أَمْ جُزِيَ بِصَعْقَةِ الطُّوْرِ" (صحیح بخاری: کتاب التفسیر: ۴۶۳۸)

مجھے دوسرے انبیاء پر فضیلت نہ دو، کیونکہ قیامت کے دن سب بیہوش ہو جائیں گے اور پھر سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے ہوئے کھڑے ہوں گے، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے یا انہیں طور کے پاس بیہوش ہونے کا بدلہ دیا گیا کہ وہ بیہوش ہی نہیں ہوئے۔

اس حدیث میں نبی علیہ السلام نے گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت بیان فرمائی، اور انبیاء کے درمیان فضیلت بیان کرنے سے منع فرمایا۔

لاتفضلونی علی یونس بن متی کی وضاحت:

ایسے ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، اس میں آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"مَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ أَنْ يَقُولَ أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتّٰى" (صحیح بخاری: کتاب التفسیر: ۴۶۳۰)

کسی بندہ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کہے میں یونس بن متی سے افضل ہوں، ان احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو افضل قرار دینے سے منع کیا۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے منع کیوں فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے تواضعاً منع فرمایا، ورنہ ایک حدیث میں اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو سب سے افضل اور سب کا سردار بتایا ہے، اس لئے آپ کا یہ فرمان تواضع کی بنیاد پر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی اس طرح فضیلت بیان نہ کرے کہ اس میں دوسرے انبیاء کی تنقیص ہو، یا ان کی شان میں گستاخی ہو، اور آپس میں تم لڑائی جھگڑا کرنے لگو۔ اس وجہ سے آپ نے منع فرمایا کہ مجھے کسی اور پر اس طرح فضیلت مت دو۔

تیسرا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اپنی رائے سے انبیاء کے درمیان فضیلت مت دو، فضیلت کے لیے بس جو نصوص موجود ہیں صرف اُن کو استعمال کرو، جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔ اگر یہ معنی ہوتے کہ فضیلت ہی مت دو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی افضلیت بیان ہی نہ فرماتے۔

شعراء کا غلو اور کچھ بے اعتدالیاں:

عام طور پر شعراء ایسی غلطیاں کرتے ہیں اور نعتیہ اشعار اور تعریفات وغیرہ میں حد سے زیادہ غلو کرتے ہیں، اور کبھی غالی فرقے بھی اس طرح کی تعبیرات وغیرہ اختیار

کرتے ہیں، جس سے انبیاء کی شان بلکہ خدا کی شان میں بھی بے ادبی ہو جاتی ہے۔

ایک شاعر نے نعت کے کچھ اشعار لکھے، جن کا مطلب یہ تھا کہ میں حضور ﷺ کی نعت لکھنے کے لیے سیاہی تیار کر رہا ہوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھ میں وہ سیاہی بنا رہا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں روتے تھے، لوگوں نے بڑی واہ واہ کی کہ کیا تعبیر ہے، کیا استعارہ ہے، حالانکہ یہ انتہائی بدتمیزی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہیں، ایک بزرگ نے اس شاعر کے جواب میں کہا تھا کہ:

ابھی اُس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوب کھرل

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی بہت سے لوگ بے ادبی کرتے ہیں۔ ایک پرانا مشہور شعر ہے جسے لوگ بیان میں بھی کہا کرتے ہیں:

بر آسمانِ چہارم مسیح بیمار است
تبسم تو برائے علاج درکار است

چوتھے آسمان پر مسیح بیمار ہیں اور اُن کے علاج کے لیے آپ ﷺ کی مسکراہٹ درکار ہے۔

علماء نے فرمایا کہ نبی کی شان میں یہ انتہائی بے ادبی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر بیمار کیوں رہیں گے؟ کیا وہ کوئی بیماری کی جگہ ہے؟ پھر آپ ﷺ کی مسکراہٹ سے اُن کی بیماری کا کیا علاج ہو گا؟ یہ تعبیر ایسی ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں بے ادبی ظاہر ہوتی ہے۔

معجزات کے مابین تقابل غلط ہے:

بعض لوگ انبیاء کے معجزات کے درمیان تقابل کرتے ہیں، جس سے بعض انبیاء کے معجزات کی حیثیت گھٹتی نظر آتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ قرآن میں ذکر فرمایا کہ آپ نے پتھر پر اپنا عصا مارا تو اس سے پانی نکل پڑا:

''فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا''(البقرۃ:۶۰)

''پس ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کے اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو، پس فورا اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے''

لوگ اس معجزہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پانی والا معجزہ ذکر کرتے ہیں آپ نے برتن وغیرہ میں اپنا دست مبارک رکھا تو پانی نکلنا شروع ہوا، اور تمام لشکر سیراب ہو گیا، لوگ اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی کا نکلنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے؟ گوشت و پوست سے پانی نکلنا یہ تعجب کی بات ہے، ان کی یہ بات غلط ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا کہنے والا دو غلطیاں کر رہا ہے، ایک غلطی تو یہ کر رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو چھوٹا ظاہر کر رہا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بطور معجزہ اور بطور دلیلِ نبوت ان سے صادر فرمایا ہے، اور یہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ) اس معجزہ کو ایسے طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی حیثیت اور اہمیت گرا دیتے ہیں، اور لوگوں کی نظر میں اس کو معمولی ظاہر کرتے ہیں، جبکہ وہ اللہ کی نظر میں بڑا ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے پانی نکلنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں ہاتھ رکھ دیا تو انگلیوں کے درمیان میں سے پانی نکل رہا تھا۔ پانی جسم میں سے نکل رہا تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے وہ پانی از خود بڑھ رہا تھا؟ یہ بات واضح نہیں ہے، اس لئے اس میں اعتدال سے کام لینا چاہیے، اس طرح تقابل کرنا غلط ہے۔

بعض لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تجلیٔ طور کے موقع پر بے ہوش ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں جا کر بھی بے ہوش نہیں ہوئے، اور حضرت موسیٰ پہاڑ پر تجلی الٰہی سے بیہوش ہو گئے، ایک شاعر نے کہا:

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفت

موسیٰ صفت کی ایک تجلی میں بے ہوش ہوگئے۔

تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

اور آپ ﷺ ذات کو دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔

اس شعر کا سمجھدار لوگوں پر اچھا اثر پڑنے کے بجائے خراب اثر پڑ سکتا ہے، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہے، ان کا جو تقدس اور احترام ہونا چاہیئے وہ اس میں نہیں ہے، اس سے کمالِ انبیاء اور شانِ انبیاء متاثر ہوتی ہے، طور پہاڑ پر اللہ پاک کی تجلی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہو جانا عیب نہیں ہے، بلکہ کمال ہے۔ طبعی چیز ہے کہ اُن پر اس کا بوجھ اتنا پڑا کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ اگر اس کو معراج کے واقعے کے ساتھ ملا کر بیان کرتے ہیں تو کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے حضرت موسیٰ نے رب ذوالجلال کی تجلی دیکھی تو بیہوش ہوگئے، لیکن آپ علیہ السلام تو حضرت جبرئیل کو دیکھنے سے بیہوش ہوگئے، کوئی بد تمیز اس طرح کی بد تمیزی کر سکتا ہے، (نعوذ باللہ من ذالک) اس میں آپ کی بڑائی نہیں بلکہ الٹا تحقیر و تنقیص ہو جائے گی، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام معراج میں گئے ہوتے اور اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہوتا تو وہ بھی وہاں بے ہوش نہ ہوتے، اگر حضور پاک ﷺ طُور پہاڑ پر مشاہدہ فرماتے تو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے تھے اسی طرح ممکن ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ بھی بے ہوش ہو جاتے، اس بات کا اندازہ اس سے ہوا کہ آپ علیہ السلام حضرت جبرئیل کو دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئے تھے، فرق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ عالمِ ناسوت میں ہوا ہے، اور سرکار دو عالم ﷺ کا واقعہ عالمِ ملکوت میں ہوا ہے، اس لئے دونوں کو جوڑا نہیں جاسکتا، اس لیے انبیاءِ کرام کے ان معجزات میں تقابل کرنا غلط ہے۔

غرض مضمون یہ تھا کہ انبیاء کے مابین تفاضل قرآن و حدیث سے ثابت ہے، اور ان میں سب سے افضل رسول اور نبی آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے، لیکن اس میں بھی اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے، کسی بھی نبی کی فضیلت اس انداز سے بیان کرنا کہ دوسروں کی شان میں تنقیص ہو یا گستاخی ہو یا بے ادبی ہو جائز نہیں ہے۔

بعثتِ عامہ کا عقیدہ:

رسالت سے متعلق عقائد میں ایک عقیدہ آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت کا عام ہونا ہے، گزشتہ انبیاء کی بعثت اور ان کی رسالت عام نہیں تھی، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کسی قوم، کسی علاقے، کسی برادری، کسی مُلک اور کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کی بعثت قیامت تک کے لیے، سارے عالَم والوں کے لیے، ہر زبان والوں کے لیے، ساری نسلوں کے لئے ہے، اسے بعثتِ عامہ کہتے ہیں۔ یہ آپ کی خصوصیت تھی، اور یہ بھی عقائد میں داخل ہے، قرآن پاک میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان کیا ہے کہ آپ سارے عالم کے لئے نبی بنایا گیا، سارے عالم کے لئے رحمت بنایا گیا، سارے عالم کے لئے رسول بنایا گیا، آپ عرب، عجم، ہر قبیلہ اور ہر قوم سارے انسانوں کے بھی پیغمبر اور رسول ہیں، اور جنات کے لئے بھی آپ نبی اور رسول ہیں۔

بعثت کی عمومیت زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے ہے:

آپ کی بعثت کی عمومیت زمان کے اعتبار سے بھی ہے اور مکان کے اعتبار سے بھی ہے، زمانے کے اعتبار سے عمومیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے انبیاء کی بعثت خاص خاص وقت یا دوسرے نبی کے آنے تک کے لئے ہوا کرتی تھی، لیکن آپ ﷺ کی بعثت قیامت تک کے لئے ہے، آپ کے بعد کوئی اور نیا نبی نہ آنے والا ہے۔ اور نہ پیدا ہونے والا ہے۔

عمومیت مکان کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت عام ہے، خاص لوگوں کے لئے یا خاص قبیلہ کے لئے یا خاص خطہ کے لئے آپ ﷺ کو نبی نہیں بنایا گیا، جیسا کہ گزشتہ انبیاء کو خاص جگہ، خاص خطہ اور خاص لوگوں اور خاص قبیلے والوں کے پاس بھیجا جاتا تھا، بلکہ آپ ﷺ کو سارے قبیلے والوں، اور ساری جگہوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ ہر برّاعظم، ہر جزیرہ اور عالَم کا ہر حصہ اس میں شامل ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قُلْ یَا أَیُّھَا النَّاسُ إِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ إِلَیْکُمْ جَمِیْعاً" (الاعراف: ۱۵۸)

"آپ کہہ دیجئے کہ اے (دنیا جہاں کے) لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں"، اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّنَذِیْراً" (سبا: ۲۸)

"اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے"

اور احادیثِ مبارکہ میں بھی آپ ﷺ نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو اپنی خصوصیت قرار دیا، پہلے یہ ہوتا تھا کہ کسی قوم کے ساتھ، کسی علاقے کے ساتھ، کسی ملک کے ساتھ، مخصوص خاندانوں کے ساتھ، مخصوص برادریوں کے ساتھ نبوت خاص ہوتی تھی، کوئی نبی کسی ملک کی طرف مبعوث ہوتے، کوئی خاص قوم کے لیے ہوتے، لیکن آپ کی بعثت میں نہ کسی ملک کی قید ہے، نہ قوم کی قید ہے، نہ تعداد کی قید ہے، نہ علاقے کی قید ہے، آپ ﷺ کی بعثت عمومی ہے۔ آپ پر ایمان لانے میں یہ داخل ہے کہ آپ کی بعثت قیامت تک کے لئے اور سارے عالَم کے لئے ہے۔ جب آپ کی بعثت اور رسالت سب کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہے تو آج کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات پہلے زمانے والوں کے لئے تھیں، یہ راکٹ کے زمانے

والوں کے لئے نہیں ہیں، اِس وقت آپ ﷺ کی شریعت اور آپ کا دین نہیں چل سکتا، اب تو حالات بدل گئے، جو ایسا کہتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے اس کا ایمان صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے ایمان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ باقی بھی ہے یا نہیں۔

آپ ﷺ جنات کے بھی نبی ہیں:

پھر آپ ﷺ کی بعثت کی عمومیت میں انسان تو انسان جنات بھی شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنات کے لئے بھی نبی بنا کر بھیجا ہے، پورے انسانوں اور پورے جنات کے لئے آپ نبی ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ نے آپ کو صرف انسانوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا تھا لیکن قرآن وحدیث کہتے ہیں کہ آپ انسانوں کے لئے بھی نبی ہیں، اور جنات کے لئے بھی نبی ہیں۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ جنات کا ذکر ہے، اور ان کو مخاطب بنایا گیا ہے اور ان کے آپ ﷺ پر ایمان لانے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، سورۂ جن میں ہے:

”قُلْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا۔ يَهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا“ (الجن: ۱ تا ۲)

آپ (ان لوگوں سے) کہیے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنّات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر (اپنی قوم میں واپس جاکر) انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے، جو راہِ راست بتلاتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور ہم (اب) اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیثِ مبارکہ میں جنات کے ایمان لانے کا ذکر ہے، اور آپ ﷺ کا جنات میں تبلیغ کے لیے جانا ثابت ہے۔ اور بعض موقعوں پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا جانا بھی ثابت ہے، ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عنہ بھی آپ کے ساتھ

تھے، ایک جگہ پہنچ کر آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک لکیر کھینچی اور کچھ دعا پڑھی اور پھر فرمایا کہ اس لکیر کے اندر رہنا، اس سے آگے نہ بڑھنا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے، بعض روایات میں ہے کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کی آواز حضرت عبد اللہ سن رہے تھے، (سنن ترمذی: کتاب الامثال، ۲۸۶۱ واخبار مکہ للفاکہی: ۲۳۱۹) تھوڑا آگے بڑھے، لیکن اتنا بھی آگے نہ گئے کہ آپ کی آواز نہ آئے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ان کے حالات عجیب و غریب نظر آرہے تھے لیکن کوئی مجھ تک نہیں پہنچتا تھا، اس حدیث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کی بعثت کے عموم میں انسانوں کے ساتھ جنات بھی شامل ہیں۔

عقیدۂ ختم نبوت بھی رسالت کا جزء ہے:

جب آپ کی بعثت عام ہے اور آپ سب سے افضل رسول ہیں، اور آپ کے تشریف لانے کے بعد سارے انبیاء کی شریعتوں اور احکام کو منسوخ کر دیا گیا ہے، اور پھر آپ کی نبوت اور رسالت کسی مخصوص زمانہ اور مخصوص وقت تک لئے نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لئے ہے تو اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ کے بعد دنیا میں کوئی نبی نہیں آسکتا، آپ پر نبوت کا دروازہ بند ہو گیا، کیونکہ جب رہتی دنیا تک کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تو اب کسی نبی کی اور کسی رسول کی ضرورت ہی نہیں رہی، اس لئے آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا، اور کسی قسم کا نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کے عقائد میں بہت ہی اہم عقیدہ ہے۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد سارے ادیان اور سارے مذاہب منسوخ ہو گئے کسی اور کی اتباع کی گنجائش نہیں، ایسے ہی آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قیامت تک کے لئے آپ ہی نبی رہیں گے، اور قیامت تک آپ ہی کی اتباع کی جائے گی، آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی اور رسول نہیں آئے

گا، جو لوگ بھی نبوت کا دعویٰ کریں گے وہ سب کافر، جھوٹے، مکار اور دھوکہ باز ہوں گے۔ قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا:

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" (الاحزاب: ۴۰)

"محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے"

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ قَرِيْبًا مِنْ ثَلَاثِيْنَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ"

(صحیح بخاری: کتاب المناقب: ۳۶۰۹ و صحیح مسلم: کتاب الفتن و اشراط الساعة: ۷۵۲۶)

"قیامت قائم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ تیس کے قریب جھوٹے دجال پیدا نہ کئے جائیں، وہ سب یہ دعویٰ کریں گے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں"

اور سنن ترمذی میں اس روایت کے بعد اتنا اضافہ مروی ہے:

"اَنَا خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ" (سنن ترمذی: کتاب الفتن: ۲۳۸۰)

"میں آخری نبی ہوں، اور میرے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا"

جیسے یہ جھوٹے مدعیانِ نبوت کافر ہوں گے ایسے ہی ان کے ماننے والے بھی کافر ہوں گے، اس لئے آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ رسالت سے متعلق چند باتیں اور چند عقائد آپ کے سامنے ذکر کئے گئے ہیں، حق تعالیٰ ہمارے عقائد کو درست فرمائے۔ (آمین)

❋ ❋ ❋

عقیدۂ ختم نبوت اور دجاجلۂ اُمت

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

الم۔ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ (البقرۃ: ۱ تا ۴)

”الم، یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ (خدا سے ڈرنے والے) لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں، چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس (کتاب) پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان (کتابوں) پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جاچکی ہیں، اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں“

برادران اسلام! آج عقائدِ اسلامی میں ایک اہم عقیدہ کی وضاحت اور اس کے چند متعلقات سنانے کا ارادہ ہے، اور وہ عقیدہ ہے عقیدۂ ختمِ نبوت، اس کا مطلب یہ

ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد قیامت تک کوئی اور نبی مبعوث نہیں ہو گا اور اگر کوئی نبوت کا دعوی کرتا ہے تو دعوی کرنے والا اور اس دعوی کی تصدیق کرنے والا دونوں جھوٹے اور کافر ہوں گے، اس مضمون پر توجہ دلانے کی اس لئے ضرورت ہے کہ دھیرے دھیرے یہ فتنہ بھی بہت پھیل رہا ہے، اور بہت سے لوگ اس کے جال میں پھنس رہے ہیں اور اپنے ایمان اور آخرت کو تباہ کر رہے ہیں، اس کے علاوہ بسا اوقات آدمی سادگی یا جہالت کی بناء پر غیر اسلامی عقائد کو بھی اسلامی عقائد سمجھ کر قبول کر لیتا ہے، نتیجۃً اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس لئے اس مضمون کو ذکر کرنے کا ارادہ ہوا۔

ختمِ نبوت کے منکرین کی پیشین گوئی:

آپ ﷺ نے جہاں ملکی، سیاسی فتنوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہیں عقائد سے متعلق پیش آنے والے فتنوں کی بھی نشاندہی فرمائی ہے، ایک حدیث میں فرمایا:

"إِنَّهُ سَيَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ" (سنن ترمذی: کتاب الفتن: ۲۳۸۰)

بے شک میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، وہ تمام کے تمام دعویٰ کریں گے کہ وہ نبی ہیں، درانحالیکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔

ایک ضعیف روایت میں ستر (۷۰) کا ذکر ہے:

"لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ سَبْعُوْنَ كَذَّابًا" (اتحاف الخیرۃ: کتاب الفتن: ۷۶۰۷)

قیامت قائم نہیں ہو گی یہاں تک کہ ستر جھوٹے (نبی) نکلیں گے۔

جھوٹے مدعیانِ نبوت اور حضور ﷺ کا خواب:

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ أُرِيتُ أَنَّهُ وُضِعَ فِي يَدَيَّ سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَفُظِعْتُهُمَا وَكَرِهْتُهُمَا، فَأُذِنَ لِي فَنَفَخْتُهُمَا فَطَارَا، فَأَوَّلْتُهُمَا كَذَّابَيْنِ يَخْرُجَانِ فَقَالَ عُبَيْدُ اللهِ أَحَدُهُمَا الْعَنْسِيُّ الَّذِي قَتَلَهُ فَيْرُوزُ بِالْيَمَنِ، وَالْآخَرُ مُسَيْلِمَةُ الْكَذَّابُ" (صحیح بخاری: کتاب المغازی: ۴۳۷۹)

اسی دوران کہ میں سو رہا تھا مجھے دکھایا گیا کہ میرے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن رکھے گئے، میں ان سے گھبرایا اور میں نے ان کو ناپسند کیا، مجھے اجازت دی گئی بلکہ حکم دیا گیا کہ میں ان کو پھونک دوں، میں نے پھونکا تو وہ دونوں اڑ گئے، میں نے اس کی تاویل کی کہ دو جھوٹے مدعیِ نبوت پیدا ہوں گے۔ اس حدیث کے راوی عبید اللہ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک اسود عنسی ہے جس کو فیروز نے یمن میں قتل کیا، اور دوسرا مسیلمۂ کذاب ہے۔

حضرت ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت:

اسود عنسی کے ساتھ حضرت ابو مسلم خولانی کی کرامت کا ایک واقعہ بھی مشہور ہے، اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کا حکم دینے لگا، حضرت ابو مسلم خولانی کے بارے میں جب پتہ چلا تو ان کو بھی بلایا، جب وہ آئے تو کہنے لگا: اَتَشْهَدُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ؟ کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ میں رسول اللہ ہوں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! اسود نے کہا کہ کیا تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دیتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، کئی مرتبہ اس بات کو پوچھا، انہوں نے یہی جواب دیا، تو اس نے انہیں آگ میں ڈالنے کا حکم دیا، آگ دہکائی گئی، اور ان کو اس میں ڈال دیا گیا، لیکن اللہ نے ان کو بچالیا، اور آگ کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا، اس کے قریبی لوگ اس سے کہنے لگے: "اِنْ لَمْ تَنْفِ هٰذَا عَنْكَ اَفْسَدَ عَلَيْكَ مَنِ اتَّبَعَكَ"

اگر آپ اس کو اپنے سے دور نہیں کریں گے تو یہ ان لوگوں میں فساد پیدا کرے گا جو آپ کی اتباع کرنے والے ہیں، چنانچہ ان کو وہاں سے نکالا گیا، وہ وہاں سے نکل کر مدینہ منورہ آئے، لیکن اس وقت تک اللہ کے نبی دنیا سے رحلت فرما چکے تھے، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنادئے گئے تھے، انہوں نے مسجد کے دروازہ پر اپنی اونٹنی کو بٹھایا، اور مسجد میں داخل ہوئے، اور ستون کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھا تو پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یمن سے! حضرت عمر نے کہا: ''مَا فَعَلَ الَّذِیْ احرَقَهُ الْکَذَّابُ بِالنَّارِ'' اس آدمی کا کیا ہوا جس کو کذاب نے آگ میں جلایا تھا؟ انہوں نے کہا: ''ذَاکَ عَبْدُ اللهِ بْنُ ثَوْبٍ'' وہ تو عبد اللہ بن ثوب ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہچان لیا اور کہنے لگے کہ میں اللہ کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم وہ نہیں ہو؟ کہنے لگے کہ ہاں میں ہی ہوں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گلے سے لگایا اور رونے لگے پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اور وہاں ان کو درمیان میں بٹھایا، اور کہا:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یُمِتْنِیْ حَتّٰی اَرَانِیْ فِیْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ مَنْ صُنِعَ بِهٖ کَمَا صُنِعَ بِاِبْرَاهِیْمَ الْخَلِیْلِ'' تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے موت نہ دی یہاں تک کہ مجھے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس آدمی کو دکھلایا جس کے ساتھ وہ کیا گیا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ (کنز العمال: فضائل الإیمان متفرقة، ۱۴۳۱۔ وتاریخ اسلام للذہبی: ۵/۲۹۴)

اللہ تعالیٰ نے اس کذاب کا کذب سب کے سامنے کھول دیا، اور اس کو ذلیل و رسوا کیا، اور حضرت ابو مسلم خولانی کی مدد فرمائی، اور ان کو آگ سے بچایا، یہ صرف اس عقیدہ پر جمنے کی برکت تھی، انہوں نے آگ میں جلنا تو پسند کر لیا لیکن کسی اور کو نبی ماننے پر راضی نہیں ہوئے۔

مسیلمۂ کذاب کا قتل:

حضور کے زمانے میں ظاہر ہونے والا یہ ایک جھوٹا مدعیِ نبوت تھا، اور دوسرا مسیلمۂ کذاب تھا، اس کی بھی ذلت ورسوائی کے واقعات عجیب وغریب ہیں، جب آپ ﷺ اس دنیا سے پردہ فرماگئے اور ادھر مسیلمۂ کذاب کا فتنہ پھیلنے لگا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے خاتمہ کا ارادہ کیا، اوراس کے اس دعویٰ پر اس سے کوئی دلیل طلب نہیں کی اور نہ اس سے مناظرہ وغیرہ کچھ کیا، بلکہ اس سے جہاد کرنے کے لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لشکر کا امیر بناکر جنگ کے لئے روانہ کیا، اللہ تعالیٰ نے مسیلمہ کذاب کو شکست دی اور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی، مسیلمہ کذاب کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل حضرت وحشی رضی اللہ عنہ اور دیگر انصار صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو قتل کیا، لیکن اس جنگ میں سینکڑوں کی تعداد میں صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، اور مہاجرین وانصار کے قراءِ کرام کی ایک بڑی جماعت اس میں شہید ہوئی۔ (عمدۃ القاری:۲۱/۲۹۸)

عقیدۂ ختم نبوت پر شہداءِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد:

اس جنگ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام کی تعداد ۱۲۰۰ کے قریب ہے۔ (شرح المشکاۃ للطیبی:۵/۱۷۰۰) قاضی منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس جنگ میں شہداءِ صحابہ کی تعداد ۱۲۵۹ لکھی ہے، اس سے قبل صحابہ کی اتنی بڑی جماعت کبھی شہید نہیں ہوئی تھی، یہ سب سے پہلا جہاد تھا جس میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد شہید ہوئی، بالخصوص اس میں مسلمان قاریوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی اور جمعِ قرآن کا سبب بھی انہیں کی شہادت بنی، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وہ تعداد ۷۰۰ یا اس سے زیادہ تھی، جانثار صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی جانیں تو اللہ کے راستے میں قربان کردیں لیکن اس عقیدہ پر حرف آنے نہیں دیا۔

جمعِ قرآن کا سبب:

جب قاریوں کی اتنی بڑی تعداد اس جنگ میں شہید ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ اگر اتنی بڑی تعداد میں قراء ایسے ہی شہید ہوتے رہیں گے تو قرآن ضائع ہو جائے گا، اس کی حفاظت بھی ضروری ہے اس لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن جمع کرنے کا مشورہ دیا، اولاً تو وہ اس کا انکار کرتے رہے لیکن بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر مان گئے، اور کھجور کی ٹہنیوں وغیرہ پر قرآن لکھنے کا حکم دیا، احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (عمدۃ القاری: باب جمع القرآن: ۲۹/۶۷)

ایسے جھوٹے نبیوں سے متعلق نبی علیہ السلام نے پیشین گوئی بیان فرمادی تھی، بلکہ وہ دو جھوٹے جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا نبی کے زمانے میں ظاہر ہوگئے تھے اور نبوت کا دعویٰ کیا تھا، ان میں سے ایک یعنی اسود عنسی کا قتل حضور کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کے قتل کا حکم دیا تھا، اور آپ کی وفات سے کچھ ہی دن قبل اس کا قتل کیا گیا۔ اور دوسرے کا قتل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہوا۔ مسیلمہ کے ساتھ نبوت کا دعوی کرنے والی ایک سجاح نامی عورت بھی تھی، اس کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ (جامع الاصول: سجاح، ۱۲/۴۸۴)

صحابہ کا سب سے پہلا اجماع ختم نبوت کے منکر کے کفر اور قتل پر ہوا:

سب سے پہلے جس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ہوا تھا وہ عقیدۂ ختم نبوت کے منکر کے کفر اور اس کے قتل پر تھا، ایسے شخص کے قتل پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا سب سے پہلا اجماع ہوا، حضرت انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب خاتم النبیین میں اس کو ذکر کیا ہے۔ (مترجم خاتم النبیین: ۱۹۷) اسی وجہ سے ہر زمانہ میں علماء اور پوری امت کا اس پر اجماع رہا کہ نبوت

آپ ﷺ پر ختم ہے، آپ کے بعد کسی طرح کا کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، آپ کے بعد کسی کی نبوت جاری نہیں ہوگی۔ صرف آپ ہی نبی رہیں گے اور نبوت آپ ہی کی رہے گی۔

قادیانی فرقہ کی ابتداء:

حضور کی پیشین گوئیوں کے مطابق اس زمانے میں بھی کچھ فرقے پیدا ہو چکے ہیں، اور ہو رہے ہیں، اور آہستہ آہستہ پھیل رہے ہیں، اور امت میں گمراہی پھیلا رہے ہیں، ان میں سے ایک فرقہ ''قادیانیوں اور مرزائیوں'' کا ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہی زمانے کے کہلائے جاتے ہیں، ''قادیان'' ''گرداس پور'' ضلع کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں کا رہنے والا ایک شخص غلام احمد قادیانی نے اس کی بنیاد ڈالی۔

شروع میں اس نے اپنے آپ کو پیر و مرشد کی حیثیت سے ظاہر کیا، بہت سے لوگ اُس کے مرید ہوگئے، ویسے بھی پنجاب میں جاہل پیروں کے ساتھ بہت زیادہ خوش عقیدگی ہوتی ہے، یہی مریدین بعد میں اس کے معتقدین بن گئے، انہی کی نسلیں چلیں، یہ لوگ اسی باطل عقیدے پر جمے رہے، جس کی وجہ سے یہ فرقہ تھوڑا سا پنپتا ہوا نظر آیا، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہ فرقہ پھیلا نہیں تھا، اس کو اُچھالا گیا اور بڑھایا گیا۔

مسلمان ان کے بہکاوے میں کیسے آتے ہیں؟

آپ لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ لوگ مسلمان کو کس طرح بہکاتے ہیں؟ اور کیسے لوگوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں؟ ویسے تو ان لوگوں کے بہت سے حربے ہیں، جن سے وہ سیدھے سادے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانستے ہیں، ان کے ساتھ ایک بڑا اشتباہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عقائد اور نظریات کو کھلم کھلا ظاہر نہیں کرتے، بلکہ خود کو مؤمن بتاتے ہیں، اور کلمہ بھی ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ہی پڑھتے ہیں، اس لئے سامنے والا تذبذب کا شکار ہوتا ہے، وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ لوگ بھی کلمہ پڑھ رہے ہیں،

نماز پڑھ رہے ہیں، خود کو مسلمان کہہ رہے ہیں، اس لئے یہ بھی مسلمان ہیں، ان کی باتیں بھی صحیح ہیں، اس طرح ان کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

قادیانیوں کی تلبیس اور اس کا جواب:

اسی طرح ایک بات یہ کہتے ہیں کہ نبوت خدا کی رحمت ہے، اور رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مسلسل جاری وساری رہے، اگر آپ ﷺ کو خاتم النبیین مانتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے بعد خدا کی رحمت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اب آپ بتائیے کہ رحمت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے یا جاری رہنا چاہیے، ان کی اس گفتگو کے بعد بھولا بھالا مسلمان یہی کہے گا کہ رحمت تو جاری رہنی چاہیے، پھر یوں کہتے ہیں کہ جب رحمت جاری رہنی چاہیے تو نبوت بھی جاری رہنی چاہیے، کیونکہ نبوت بہت بڑی رحمت ہے، اس لئے آپ ﷺ کے بعد بھی نبی ہونا چاہیے، تاکہ رحمت کا سلسلہ چلتا رہے اور ختم نہ ہو، اور اس رحمت کو ہمارے نبی مرزا غلام احمد قادیانی لے کر آئے ہیں۔ اس طرح کی بیہودہ دلیل سے بھولے بھالے مسلمانوں کو پھانس لیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، آپ رحمت ہی لے کر آئے ہیں، اور آپ کی رحمت کا یہ سلسلہ قیامت اور اس کے بعد بھی جاری رہے گا، تو آپ کی رحمت جاری ہے، اس میں کسی اور کو ڈسٹرب کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ اجازت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں صراحۃً جب آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کو بیان کیا گیا ہے، اور آپ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا انکار کیا گیا ہے تو بس اس کا انکار ہی کیا جائے گا، چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

آپ کی رحمت تا قیامت:

ان کی اس تلبیس کے جواب کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں، مثال بھی صرف ان کے

من گھڑت خیالات کو رد کرنے کے لئے ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مثال اس عقیدہ کے شایان شان بھی نہیں اور نہ مکمل طور پر منطبق ہوتی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ اگر ایک بڑے ہال میں ایک ہزار والٹ کا بڑا بلب روشن کر دیا جائے جس سے پورا ہال روشن ہو جائے، تو اب آپ بتایئے کہ کیا وہاں سو والٹ کے چھوٹے چھوٹے بلب روشن کرنے کی ضرورت باقی رہے گی؟ ہر صاحبِ عقل شخص یہی کہے گا کہ ہزار والٹ کے بلب کے بعد کسی چھوٹے بلب کی ضرورت ہی نہیں، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سمجھئے کہ جب آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر رحمت کا اتنا بڑا دریا اور سمندر بہایا گیا اور وہ دریاءِ رحمت قیامت تک جاری وساری رہے گا تو اس کے بعد کسی اور بلب کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد کسی اور بندہ کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے اور رحمۃ للعالمین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کے جانے بعد رحمت ختم ہو گئی، بلکہ آپ کے آنے کے بعد تو رحمت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ میدانِ حشر میں بھی آپ کی رحمت کا سایہ ہو گا، شفاعت آپ ہی کی حاصل ہو گی، آپ ہی کے دستِ مبارک سے حوض کوثر سے پانی پلایا جائے گا، تو آپ کے آنے سے رحمت کا نہ ختم ہونے والا، نہ رکنے والا اور سب کو سیر اب کرنے والا ایک دروازہ کھل گیا، اس لئے اب کسی اور کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان بھولے بھالے لوگوں کو یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ اس بات کا کہنے والا حقیقت میں کیسا ہے؟ اس کے حالات پڑھنے کے بعد ان کو اندازہ ہو گا کہ وہ کیسا تھا، اس کی صفات کیسی تھیں؟ اس کی عادات کیسی تھیں؟ دینداری اس میں تھی یا نہیں؟ تقویٰ اس میں تھا یا نہیں؟ اسلام پر وہ عمل پیرا تھا یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

قادیانیوں کا دوسرا دھوکہ اور اس کا جواب:

ان کا ایک حربہ اور دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں ہر بڑے نبی کے بعد ان کی تعلیمات اور کارِ نبوت انجام دینے کے لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے انبیاء مبعوث کئے گئے، جیسے نوح علیہ السلام کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بہت سے انبیاء آئے، جو پہلے انبیاء کی تصدیق کرتے رہے، ان کی تعلیمات آگے پھیلاتے رہے، پس یہ نبی کے کمال میں ہے کہ بڑے نبی کے بعد چھوٹے نبی آتے رہیں، اور اس فریضہ کو انجام دیتے رہیں، اگر ہمارے نبی کے بعد کوئی نبی نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کمال ہمارے نبی میں نہیں، اور اس سے ہمارے نبی کی شان میں کمی آئے گی اور ان کا مقام و مرتبہ گھٹ جائے گا، نعوذ باللہ! اس لئے یہ بات ماننی پڑے گی کہ آپ کے بعد نبی آنا چاہیئے، جیسے پچھلے پیغمبروں کے ساتھ بہت سے نبی آئے تھے۔ اس کے لئے یہ قادیانی لوگ ایک حدیث کا سہارا لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ“

”میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں“

اس سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جیسے گزشتہ بڑے انبیاء کے بعد نبی آتے رہے اور دعوت و تبلیغ کرتے رہے اسی طرح اس امت میں بھی ان گزشتہ انبیاء کے مانند لوگ آئیں گے اور اس کام کو انجام دیں گے، جیسے وہ نبی ہوتے تھے اسی طرح یہ بھی نبی ہوں گے، ان ہی میں سے ایک ہمارا نبی مرزا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس امت کو وہ شرف اور وہ عظمت عطا فرمائی ہے کہ پچھلی امتوں میں بڑے پیغمبروں کے بعد دوسرے انبیاء آکر جو کام کیا کرتے تھے اس امت میں وہ کام آپ کے امتی اور آپ کے وارث علماءِ کرام کریں گے۔

جیسا کہ حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ وُرِّثُوا الْعِلْمَ" (صحیح بخاری: کتاب العلم: باب العلم قبل القول والعمل)

اور سنن ترمذی میں ہے: "إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِيْنَارًا وَلاَ دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ" (سنن ترمذی: کتاب العلم: باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، ۲۶۸۲)

بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء دینار اور درہم کے وارث نہیں بناتے، بلکہ وہ علم کے وارث بناتے ہیں۔

اس لئے اس امت میں انبیاء کا کام علماء کریں گے، انبیاء نہیں، جیسا کہ احادیث میں صراحت ہے، اور پھر آپ ﷺ نے اپنے خاتم ہونے کی اور اپنے بعد نبی ہونے کی نفی بھی کی ہے۔

رہی وہ روایت جس کا وہ حوالہ دیتے ہیں: "عُلَمَاءُ أُمَّتِيْ كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ" کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں" اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ بے اصل ہے، اور من گھڑت ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح: کتاب المناقب: باب مناقب علی، ۱۷/۴۲۴)

اور اگر ہم تسلیم بھی کرلیں تو یہ حدیث ان ہی کے خلاف حجت ہے، کیونکہ حدیث میں نبی علیہ السلام نے علماء کو انبیاء قرار نہیں دیا، بلکہ یہ بتایا ہے کہ گزشتہ اس کام کو تو پیغمبر کیا کرتے تھے لیکن اس امت کا شرف یہ ہے کہ اس کام کو انبیاء نہیں بلکہ علماء کرام کریں گے۔ ان دونوں حدیثوں کے مضمون میں کوئی تضاد نہیں ہے، دونوں کا مطلب یہی ہے کہ اس امت کے علماء اُس فریضہ کو انجام دیں گے جو نبی لے کر آئے تھے، لہٰذا جب علماء اس کام کو انجام دیں گے تو اب نبی کی کیا ضرورت ہے؟

آپ ﷺ کی ایک خصوصیت:

ایک بات اور یہ بھی ہے کہ گزشتہ انبیاء کرام دنیا میں تشریف لاتے تو مخصوص وقت تک کے لئے اور مخصوص لوگوں کے لئے ہی تشریف لاتے، ان کا وقت محدود ہوتا تھا، ان کا علاقہ خاص ہوتا تھا، کوئی نبی خاص قوم کے لئے آئے تو کوئی خاص قبیلہ کے لئے آئے، ان کے آنے کے بعد لوگ مسلمان ہوتے، اور دین پھیلتا اور جب وہ چلے جاتے تو ان کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا چھا جاتا، گمراہی عام ہو جاتی، اور لوگوں کو کوئی راستہ بتانے والا اور حق بتانے والا نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ پھر ایک پیغمبر کو بھیجتے، اور وہ ان میں رشد وہدایت کا کام کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منصبِ نبوت سے مخصوص وقت تک کے لئے اور مخصوص لوگوں کے لئے نہیں نوازا، بلکہ آپ کی نبوت اور آپ کی رحمت کو عام بنایا، اور سارے لوگوں کے لئے آپ کو نبی بنا کر بھیجا۔

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" (سبا:۱۸)

"اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، (ایمان لانے پر ان کو ہماری رضا وثواب کی) خوشخبری سنانے والے اور (ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب وعذاب سے) ڈرانے والے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے"

امتِ محمدیہ کی خصوصیت:

چونکہ آپ کو خاص وقت تک کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے نبی بنایا گیا ہے اس وجہ سے اس امت پر قیامت تک کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ بالکل ہی اندھیرا چھا جائے، اور سارے لوگ ضلالت اور گمراہی میں مبتلا ہو جائیں، اور ان کو کوئی راہ بتانے والا نہ ہو، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ مَنْصُوْرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ“(سنن ابن ماجہ: باب اتباع سنۃ رسول اللہ، ۱۰ و سنن ترمذی: کتاب الفتن: باب ما جاء فی الشام، ۲۳۵۱)

ہمیشہ میری امت میں ایک جماعت حق پر رہے گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد اور تائید ہوتی رہے گی، ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا وہ آدمی جو ان کی مخالفت کرے گا، یعنی دلائل کے اعتبار سے ان پر کوئی غالب نہیں آئے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ پوری کی پوی امت کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی، اور نہ پوری امت کسی غلط بات پر اتفاق کر سکتی ہے، ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

”لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ عَلَى الضَّلَالَةِ أَبَدًا“ (المستدرک علی الصحیحین: کتاب العلم، ۳۹۲)

اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں فرمائیں گے، کچھ نہ کچھ لوگ حق پر جمے رہیں گے، اسی لئے اگر امتِ مسلمہ کا کسی بات پر اتفاق ہو جائے تو وہ خود اس کے حق ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔

بگاڑ کی اصلاح علماء اور مجددین کی ذریعہ:

غرض اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ نظام بنا رکھا ہے کہ کبھی امت پر ایسا وقت نہیں آئے گا کہ بالکل اندھیرا چھا جائے، ہاں ضلالت مختلف شکلوں میں اور مختلف قسم کے افراد میں یقیناً پائی جائے گی، اور امت میں بگاڑ آئے گا، لیکن اس کی اصلاح علماء فرمائیں گے، اور اس بگاڑ کا دفاع علماء اور مجددین کریں گے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا“ (سنن ابی داؤد: کتاب الملاحم: باب ما یذکر فی قرن المائۃ، ۴۲۹۳)

بے شک اللہ تعالیٰ ہر سو سال میں اس امت میں ایسے آدمیوں کو پیدا کریں گے جو امت

کے لئے دین کی تجدید کا کام کریں گے۔ جو دین کو بالکل صاف ستھرا کر دیں گے، جو لوگوں کی غلط آراء، غلط فکروں، غلط عادتوں کی اصلاح فرمائیں گے، اور امت میں پیش آمدہ مسائل کا حل کریں گے۔ غرض جب آپ کی نبوت اور رحمت عام ہے، اور قیامت تک کے لئے ہے، اور تا قیامت یہ امت مکمل گمراہی میں مبتلا نہیں ہو سکتی، اور کچھ اہلِ حق علماء رہیں گے جو دین کو تھامے ہوئے ہوں گے، دعوت و تبلیغ کرتے رہیں گے، اور لوگوں کی اصلاح کا کام کرتے رہیں گے، یا مجدد دین رہیں گے جو دین کی تجدید کا کام کرتے رہیں گے، تو پھر کسی اور نبی کی کیا ضرورت ہو گی؟ اس لئے آپ ﷺ کے بعد دنیا میں کوئی نبی نہیں آئے گا۔

مرزا کے مختلف دعوے:

مرزا نے اس فتنہ کی جو ابتداء کی کچھ اس کے بارے میں بھی سنتے چلیں کہ کیسے اس نے اس فتنہ کی بنیاد ڈالی؟ شروع میں تو اس نے اپنے آپ کو عام مسلمان قرار دیا کہ میں بھی ایک عام مسلمان ہوں، میرا عقیدہ بھی اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہے، میں بھی حضور ﷺ کو خاتم النبیین مانتا ہوں، میں بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیتا ہوں، میرا بھی عقیدہ یہی ہے کہ جو حضور ﷺ کو خاتم النبیین نہ مانے وہ کافر ہے، یہ باتیں شروع میں اس نے لکھیں، ظاہر ہے کہ جب کسی کو کنوینز (convince) کرنا چاہیں تو ابتداءً بڑے بڑے دعوے تو نہیں کئے جاسکتے، کیونکہ اس سے لوگ دور ہو جاتے ہیں اور ان کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اولاً وہ عام تاثر دیتے ہیں کہ یہ ایک بزرگ ہیں، یہ ایک بڑے عالم ہیں، مفسر ہیں، پھر جب کسی کو اپنا ہم خیال بنالیتے ہیں اور اپنے سے مانوس کر لیتے ہیں تو آہستہ آہستہ اپنے منشے کی باتیں کرنے لگتے ہیں، اس طرح فتنہ کو تدریجی

طور پر پروان چڑھاتے ہیں، چنانچہ اولاً اس نے بھی ایسا ہی کیا، اپنے آپ کو عام مسلمان بتایا، اس کے بعد دھیرے دھیرے اپنے آپ کو پیر و مرشد کہنے لگا، پھر مفسر اور محدث کی حیثیت سے ظاہر کیا، اور پھر مجدد ہونے کا دعویٰ کیا، پھر آپ کو مہدی موعود کہنے لگا، پھر مسیحِ موعود ہونے کا دعوی کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو دنیا میں تشریف لانے والے ہیں وہ میں ہی ہوں، جتنی باتیں ان سے متعلق قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہیں وہ سب میرے بارے میں کہی گئیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اس نے کہا:

"ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے"

یہ اس کا اپنا شعر ہے۔ اس سے کہا گیا کہ جب تم اُن سے بہتر ہو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بہت سے معجزے دکھاتے تھے۔ کہنے لگا کہ یہ سب مسمریزم ہے، مسمریزم مجھے پسند نہیں ہے، اس لئے میں یہ سارے کام نہیں کرتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس نے یوسف نجار کا بیٹا کہا۔

اپنے اوپر وحی کے نزول کا دعویٰ کرتا تھا۔

قرآن پاک کی آیتوں کی تحریف کرتا تھا۔

اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں کہتا تھا جو دین اور اسلام کے خلاف تھیں۔ اس وجہ سے علماء نے اس کے بارے میں متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ کافر ہے۔

اخیر میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور اپنے آپ کو تمام پیغمبروں سے افضل قرار دیا۔ لیکن نبوت کا دعویٰ اس نے یوں ہی نہیں کیا بلکہ اس کی تقسیم کر دی، اس نے یہ سوچا کہ اگر میں باضابطہ نبی ہونے کا دعوی کروں تو بہ آسانی لوگ اس کو قبول نہیں کریں گے، اس لئے اس نے نبوت کی من گھڑت تقسیم کی، اور کہنے لگا کہ نبوت کی دو

قسمیں ہیں، تشریعی اور غیر تشریعی، ایک حقیقی نبی ہوتا ہے اور دوسرا ظلی اور بروزی، اور میں غیر تشریعی ظلی اور بروزی نبی ہوں۔

قادیانیوں کے تین گروہ:

مرزا کے مختلف دعووں کے نتیجہ میں اس کے متبعین بھی تین فرقوں میں بٹ گئے، ایک فرقہ اس کو صاحبِ شریعت نبی مانتا ہے، یہ ظہیر الدین اروپی فرقہ کہلاتا ہے۔ دوسرا فرقہ غیر تشریعی نبی مانتا ہے، یہ مرزا محمود کے متبعین ہیں۔ تیسرا فرقہ نبی ورسول تو نہیں مانتا مگر مسیح موعود اور مہدیِ موعود قرار دیتا ہے یہ محمد علی لاہوری کے متبعین ہیں۔

جھوٹے مدعی نبوت سے مطالبہ دلیل بھی مستلزمِ کفر ہے:

علماء نے پہلے ہی سے اس عقیدہ کی وضاحت کر دی ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، آپ خاتم النبیین ہیں اور جو نبوت کا دعویٰ کرے وہ بھی کافر ہے اور جو اس کو مانے وہ بھی کافر ہے، علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے آدمی نے اس سے پوچھا کہ تیرے پاس دلیل کیا ہے؟ تو یہ پوچھنے والا کافر ہو جاتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ امکانِ نبوت کو تسلیم کر رہا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، تبھی تو یہ دلیل مانگ رہا ہے، اس کی دلیل بھی نہیں مانگنی چاہیئے، جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدھا مسیلمہ کذاب سے جنگ کی، یہ نہیں پوچھا کہ تیرے پاس دلیل کیا ہے؟ بس حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لشکر کا امیر بنا کر اس سے جنگ کے لئے بھیج دیا اور کہا کہ اس کو ختم کر دو، اس لئے ان سے دلیل مانگنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ کافر ہیں اور دوسروں کو بھی کافر بنا رہے ہیں۔

یہ دنیا بھی بڑی عجیب ہے، یہاں جو آدمی جس چیز کا دعوی کرتا ہے یا جو بات کہتا ہے تو کچھ لوگ ضرور اس کے دعوی کو قبول کرنے والے مل جاتے ہیں، دعویٰ صحیح ہو یا غلط،

کچھ لوگ تو اس کو قبول کر ہی لیتے ہیں، کوئی مجدد ہونے کا دعوی کرتا ہے تو اس کے متبعین پیدا ہو جاتے ہیں، کوئی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو بھی متبعین مل جاتے ہیں، اس خبیث نے نبوت کا جھوٹا دعوی کیا تو لوگ اس کو مان گئے، اسود عنسی نے جھوٹا دعویٰ کیا تو لوگوں نے اس کو مان لیا، مسیلمہ کذاب نے جھوٹا دعویٰ کیا تو لوگوں نے اسے مان لیا، یہ دنیا امتحان کے لئے بنائی گئی ہے، اس میں اس طرح کے لوگ مل جائیں گے، بلکہ اگر کوئی یہاں خدا ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کو بندے بھی مل جاتے ہیں، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تو اس کو بھی ماننے والے مل گئے، اور مرزا کے متعلق بھی یہی کوششیں ہو رہی تھیں کہ اسے خدا بنا دیا جائے لیکن اس سے قبل ہی اللہ نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

کذاب مرزا کی موت:

اور اسے بڑی عبرتناک موت دی، تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کتنے ناراض ہیں، اس حالت میں اس کی موت ہوئی کہ وہ طہارت خانہ میں تھا اور غلاظت اس کے منہ سے نکل رہی تھی، ظاہر ہے کہ جب اس قسم کی بکواس بکے گا تو اس کا انجام بھی ایسا ہی ہو گا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی لوگوں کو بطورِ عبرت دکھا دیا کہ تم لوگ جس کو نبی مانتے تھے دنیا میں اس کا انجام یہ ہے۔

دنیا دھوکہ کی جگہ ہے:

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، بلکہ دھوکہ کی جگہ ہے، یہاں صحیح اور غلط، حق اور باطل دونوں چیزیں ہیں، ان میں آدمی تمیز نہیں کر پاتا ہے کہ صحیح کیا ہے؟ اور غلط کیا ہے اور دھوکہ کھا جاتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اس مضمون کو جگہ جگہ ذکر فرمایا:

"فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ" (الفاطر:۵)

"سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے، اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکے میں ڈال دے"

آیت کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ یہ آیت افکار کے اعتبار سے نظریوں کے اعتبار سے، عقیدوں کے اعتبار سے عبادتوں کے اعتبار سے، معاملات اور معاشرت کے اعتبار سے، کلچر اور تہذیب کے اعتبار سے کامیابی اور ناکامی کے اعتبار سے، سچ اور جھوٹ کے اعتبار سے، انصاف اور ظلم کے اعتبار سے دھوکہ کو شامل ہے۔

قادیانیوں کا ایک اور دھوکہ:

ان معاندین اور فتنہ پروروں کی ایک حرکتِ قبیح دھوکہ بھی ہے، یہ کلمہ کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے لوگوں میں اپنے عقائد وافکار کی تبلیغ کرتے ہیں اور یہی چیز زیادہ قابلِ اعتراض اور تشویشناک ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اسلام کے روپ میں ڈھال کر اسلامی عقائد کا سہارا لیتے ہوئے فتنہ کو بڑھاوا دیتے ہیں، جس کے سبب لوگ ان کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں، اوران کی دعوت کو اسلامی دعوت اوران کی فکر کو اسلامی فکر اوران کے عقائدِ فاسدہ کو اسلامی عقائد سمجھتے ہوئے ان کی بات قبول کر لیتے ہیں، حالانکہ ان کا عقیدہ غلط ہوتا ہے، گویا وہ دین اور اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے عیسائیت کی تبلیغ کر رہا ہے، اگرچہ وہ غلط کام کر رہا ہے لیکن وہ کسی کو دھوکہ تو نہیں دے رہا ہے، وہ صاف بتا رہا ہے کہ میرا مذہب عیسائیت ہے اور اسی کی لوگوں میں تبلیغ کر رہا ہے، لیکن کسی اور کے مذہب کا سہارا تو نہیں لے رہا ہے، بُدھسٹ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں، برہمن اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں، غیر مسلم اور مشرکین اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں،

دہریے، ملحدین اور منکرینِ خدا الحاد وغیرہ کی دعوت دیتے ہیں لیکن کسی اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے، ان کے بر خلاف یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے کلمہ پڑھتے ہوئے، اسلامی وضع قطع رکھتے ہوئے اپنے مذہب کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ ان کی یہ دعوت اسلامی نہیں بلکہ کفریہ ہوتی ہے، اور لوگ ان کے اس دھوکہ کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کا شکار بن جاتے ہیں، قادیانی ہوں، صدیق دیندار کے ماننے والے ہوں، بوہرے ہوں، یا کوئی اور ہو، یہ سب وہ لوگ ہیں جو گمراہ بھی ہیں اور دھوکہ باز بھی ہیں، دھوکہ باز اس معنی میں کہ غیر اسلامی افکار وعقائد کو اسلام کے نام پر پیش کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے سادے مسلمان ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں، ان کو کیا اندازہ ہوگا کہ یہ بندہ کیا بول رہا ہے؟ اور اس کا ایک بول اس کو ایمان سے نکالنے اور اس کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر وہ لوگ اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کریں، لوگوں کے سامنے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو پیش نہ کریں، اسلامی وضع قطع اتار کر اپنی دعوت دیں تو یقینا مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کے جال میں پھنسنے سے بچ جائے گا، اسی لئے یہ لوگ دوسرے غیر مسلموں کے مقابلہ میں جرم میں بڑھے ہوئے ہیں۔

ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت اور پھٹکار ہو، ان کے اس دھوکہ سے مسلمانوں کو واقف کروانا ضروری ہے اور مسلمانوں کو اس معاملہ میں بہت ہی محتاط رہنا ضروری ہے، اس لئے اس موضوع سے متعلق چند باتیں ذکر کی جارہی ہیں، اگرچہ اس عقیدہ کے اثبات کے لئے ایک دلیل بھی کافی ہوسکتی تھی لیکن اللہ پاک نے بار بار مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے اس کو موکد اور مبرھن فرمادیا، تاکہ اس میں لوگوں کو کسی قسم کا دھوکہ اور خلجان نہ رہے۔

تحفظ کا راستہ:

اب سوال یہ ہے کہ ان فتنوں سے کیسے بچیں؟ اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھیں؟ اور حق وباطل میں تمیز کیسے کریں؟ تو اس کا جواب ایک حدیث میں نبی ﷺ نے بیان فرمایا ہے:

"تَرَکْتُ فِیْکُمْ أَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا کِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ نَبِیِّهٖ" (موطا مالک: کتاب القدر: باب النهی عن القول بالقدر: ۳۳۳۸)

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، تم ہر گز گمراہ نہیں ہوگے جب تک تم ان کو تھامے رہو گے، ایک کتاب اللہ اور دوسرے سنت رسول اللہ، یہ دو بنیادی چیزیں ہیں، اور ان کو سمجھنے کے لئے ان کے ماہرین سے رجوع کرنا چاہیئے کہ کیا حق ہے کیا ناحق ہے؟ اس کے لئے قرآن و حدیث کے ماہرین کا سہارا لینا پڑے گا، اور ان کی تحقیق پر اعتماد کرنا پڑے گا، خود مجتہد بن کر اگر قرآن وحدیث کو براہِ راست پڑھو گے تو پھر ایسے ہی فتنے کھڑے ہو جائیں گے، امتِ مسلمہ جب تک علماء سے جڑی رہے گی اور جہاں خلجان ہو علماء کرام سے پوچھ پوچھ کر چلتی رہے گی تو ان فتنوں کے سیلاب اور ان کے جال سے اپنے آپ کو بچا سکے گی۔

اس فتنہ کے دفاع میں علماء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تردید کی ہے، اور اس میں ایک دو نہیں، بلکہ دو دو سو، تین تین سو دلائل سے صرف اسی مسئلہ کو ثابت کیا ہے، اور باطل فرقوں کا جواب دیا ہے، جب اس عقیدہ کے اتنے سارے دلائل ہوں تو آپ اندازہ لگائیے کہ اس عقیدہ کی کتنی اہمیت ہے؟ اور اس کا انکار کتنی خطرناک بات ہوگی؟

ان دلائل کو پڑھنا چاہیئے، بالخصوص اس موضوع پر حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدلل و مفصل شہرۂ آفاق کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہی انہوں نے

"ختمِ نبوت" رکھا ہے، جس میں مسئلۂ ختمِ نبوت کو سو آیاتِ قرآنیہ اور دو سو دس احادیث مبارکہ اور اجماعِ امت سے ثابت کیا ہے، اور اس مسئلہ کے ہر پہلو کو واضح کیا ہے، صحابہ، تابعین، تبعِ تابعین، مفسرین، محدثین، فقہاء مجتہدین اور صوفیاء کے فتاویٰ، اقوال اور تائیدات نقل کی ہیں۔

اس لئے میرے بزرگو! اس سلسلہ میں بہت محتاط اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے، لوگ اس فتنہ کو اس ملک میں بھی پھیلانے کی بہت کوشش کر رہے ہیں، برطانیہ میں بھی اس پر بہت کوششیں ہو رہی ہیں، بلکہ اس کا مرکز وہیں ہے اور انڈیا پاکستان میں اور وہاں کے دیہاتوں وغیرہ میں بھی یہ فتنہ بہت پھیلایا جا رہا ہے، اور وہ اپنے ٹھکانے بدل بدل کر مختلف حربے اختیار کر کے پیسوں کا لالچ دیکر پھسلا رہے اور علماء بھی اس کے دفاع کی کوششیں کر رہے ہیں، شہروں اور دیہاتوں میں اس کام میں لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اور ساری امت مسلمہ کو اس فتنہ سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

عقیدۂ ختمِ نبوت آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ”مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا“ (الاحزاب: ۴۰)

ترجمہ: محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

اسلام کے بنیادی اور اجماعی عقیدوں میں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، اس سے قبل اس مضمون پر کچھ گفتگو کی گئی تھی، آج بھی چند باتیں اس تعلق سے ذہن میں رکھیں۔ صاحبِ روح المعانی نے اسی آیت کے ذیل میں اس عقیدہ پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ (روح المعانی: ۱۶/۱۴۲)

آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ و متواترہ سے یہ عقیدہ ثابت ہے، اور تمام تفاسیر معتبرہ و کتبِ فتاوی میں بھی اس عقیدے کو واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے، اور آپ کے بعد نہ کوئی نبی پیدا ہوگا اور نہ آپ کے بعد کسی پر کسی قسم کی نبوت جاری وساری ہوگی، جو اس کے خلاف عقیدہ رکھے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

کلمہ کے اقرار کے باوجود کفر کا حکم کیوں؟

بعض مرتبہ اگرچہ آدمی ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کہہ رہا ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا یہ عقیدہ نہ ہو تو وہ کلمہ کہنے کے باجود کافر شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ کلمہ کے تقاضے کے خلاف ہے، اس کلمہ میں خود یہ مضمون بھی شامل ہے، کلمہ کے اقرار اور اس کو تسلیم کرنے کے بعد ایسی کوئی بات کہنا یا ایسا کوئی عقیدہ اختیار کرنا جو اسلام کی ضروری تعلیمات پر اثر انداز ہوتا ہو، یا اُس سے ان کا انکار ہوتا ہو یا ان کا استہزاء ہوتا ہو تو ایسی صورت میں باوجود لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے کے آدمی اسلام سے خارج شمار کیا جاتا ہے، لوگ اس کو ذہن میں نہیں رکھتے، اور یہ کہتے ہیں کہ چونکہ وہ کلمہ پڑھتا ہے، ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پڑھتا ہے، اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، اس لئے اس کو مسلمان سمجھنا چاہیے۔ جواب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود جو شخص ایسی کوئی بات کہے جو اسلام کے خلاف ہے، ایمان کے خلاف ہے، لا الہ الا اللہ کے تقاضے کے خلاف ہے، محمد رسول اللہ کے تقاضے کے خلاف ہے، تو کیسے اس کو مسلمان کہیں گے ؟ اگر مسلمان ہے تو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں، مثلاً محمد ﷺ کو بھی نبی مان رہا ہے اور مرزا قادیانی کو بھی نبی مان رہا ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ پڑھ رہا ہے، بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ اس وجہ سے اس کو کافر قرار دیں گے۔

منافقین کی گواہی کے باوجود باری تعالیٰ کا انکار:

جیسے منافقین کو باوجودیکہ وہ اللہ کو ماننے کا اقرار کرتے تھے اور آپ ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دیتے تھے لیکن پھر بھی اللہ پاک نے انہیں کافر قرار دیا ہے۔

فرمایا: ”إِذَا جَاءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللهِ وَاللهُ یَعْلَمُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللهُ یَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُوْنَ“

”جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں (اس میں تو ان کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (باوجود اس کے) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں“

یہاں اللہ پاک کہہ رہے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، یہ کافی نہیں ہے کہ محض زبان سے کلمہ کا اقرار کرلیا جائے، بلکہ گواہی دینے کے بعد ما جاء بہ النبی ﷺ کی دل سے تصدیق کرنا بھی ضروری ہے، اور دین کی بدیہیات اور ضروری چیزوں کو ماننا اور اس پر باقی رہنا بھی ضروری ہے، اگر ان میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار ہو تو وہ کافر ہوگا، وہ اپنے اس کلمہ میں جھوٹا شمار ہوگا، اور اسے مومن نہیں کہا جائے گا۔ اس لئے چاہے وہ کلمہ کا اقرار کیوں نہ کریں لیکن جب تک دین کے مسلمہ اور ضروری عقائد کو نہیں مانیں گے اس وقت تک انہیں مومن نہیں کہا جاسکتا۔

نبوت کی من گھڑت تقسیم:

یہ بات اس سے پہلے آچکی ہے کہ قادیانی اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ نبوتِ تشریعی کا سلسلہ تو ختم ہوگیا، یعنی شریعت والا نبی تو نہیں آسکتا لیکن بغیر شریعت والا نبی آسکتا ہے، ظلی اور بروزی نبی آسکتا ہے، ظلی اور بروزی نبی کا مطلب یہ ہے کہ محمدی شکل اور محمدی نبوت کا مکمل عکس اور آئینہ بن کر کوئی دوسرا آسکتا ہے؟ اس کو ظلی اور بروزی نبی کہتے ہیں، اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو یہی کہتے ہیں کہ وہ ظلی اور بروزی نبی تھا، نعوذ باللہ! آپ ﷺ

کے خاتم النبیین ہونے کے مفہوم میں جہاں یہ بات داخل ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہ پیدا ہو گا اور نہ آئے گا، اسی طرح اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی پر کسی قسم کی نبوت جاری نہیں ہو گی، قرآن وحدیث میں نبوت کی اس طرح تقسیم نہیں کی گئی، جس طرح یہ لوگ کرتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء: باب ما ذکر عن بنی اسرائیل: ۳۴۵۵)

میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا، آپ کا یہ فرمان عام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس پر لفظِ نبی بولا جائے وہ آپ کے بعد نہیں آسکتا، چاہے وہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی ہو، ظلی اور بروزی نبی ہو، یا کوئی اور ہو ''لانبیَّ'' کی نفی سے نہیں بچ سکتا، نبوت کی ہر قسم ''لانبی'' کی نفی کے تحت داخل ہے، اس لئے علماء اس کی باضابطہ صراحت کرتے ہیں کہ کسی بھی قسم کا کوئی نبی آپ کے بعد نہیں آئے گا، اور آپ کے سوا کسی قسم کی نبوت جاری نہیں ہو گی۔

نزولِ عیسیٰ ختمِ نبوت کے منافی نہیں:

یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے بلکہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے بعد بھی نبوت جاری ہو سکتی ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصوص میں صراحت ہے کہ وہ آخری زمانے میں آئیں گے، اور وہ اللہ کے نبی تھے، لہذا جب وہ آئیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا نبوت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ باقی ہے، لہذا آپ کے بعد بھی نبوت جاری رہ سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں یا

احادیث مبارکہ میں جہاں آپ ﷺ کے بعد نبوت کے ختم ہونے کا ذکر ہے تو وہاں اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی منصبِ نبوت پر فائز نہیں ہو سکتا، آپ کے بعد کسی کو نبوت کا تاج نہیں پہنایا جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی نبی بن کر آچکے ہیں اور وہ آسمان پر جاچکے ہیں، جب قربِ قیامت تشریف لائیں گے تو نبی بن کر تشریف نہیں لائیں گے بلکہ آپ ﷺ کے امتی اور آپ کے متبع اور آپ ﷺ کے نائب بن کر تشریف لائیں گے۔ اور آپ کا شمار انبیاءِ سابقین ہی میں ہو گا۔ (روح المعانی: ۱۴۲/۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بحیثیتِ امتی تشریف لانے کے دلائل:

اگر کوئی یہ کہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ کی اتباع کریں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے ان کو اپنا خلیفہ قرار دیا، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

كَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ، وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ (صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء: باب ماذکر عن بنی اسرائیل، ۳۴۵۵)

بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کرام کیا کرتے تھے، جب بھی ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرے نبی آجاتے، بے شک میرے بعد نبی نہیں ہے، ہاں میرے بعد خلفاء رہیں گے، اس سے ثابت ہوا کہ آپ کے بعد نبی نہیں ہوں گے، بلکہ خلفاء ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ جب وہ نبی نہیں ہوں گے تو امتی ہوں گے، اگر بحیثیت نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لاتے تو اس کی وضاحت کرتے، لیکن آپ نے فرمایا کہ نبوت ختم ہو جائے گی، اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ سن لو! وہ میرے بعد میرے خلیفہ ہوں گے۔

"اَلَا اِنَّهٗ خَلِيْفَتِيْ مِنْ بَعْدِيْ" (المعجم الصغیر: باب العین، ۴۸۹۸)

اس لئے وہ آپ ہی کی اتباع کریں گے، اور اس امت کو آپ ہی کی تعلیمات کا حکم دیں گے اور اسی کی طرف بلائیں گے۔

موسیٰ زندہ ہوتے تو میری ہی اتباع کرتے:

اس کے علاوہ ایک اور حدیث سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

"إِنَّا نَسْمَعُ أَحَادِيْثَ مِنَ الْيَهُوْدِ تُعْجِبُنَا أَفَتَرٰى أَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا؟

یارسول اللہ! ہم یہود سے بعض باتیں سنتے ہیں تو ہمیں وہ اچھی لگتی ہیں، آپ کا حکم کیا ہے، ہم اس کو سنیں یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

"أَمُتَهَوِّكُوْنَ أَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ إِلَّا اتِّبَاعِيْ" (شعب الایمان للبیهقی: ذکر حدیث جمع القرآن: ۱۷۴)

کیا تم بھی ہلاکت کے گڑھے میں گر جاؤ گے جیسا کہ یہود و نصاریٰ ہلاک ہو گئے تھے؟ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تب بھی ان کو میری اتباع کے علاوہ کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

اور دوسری روایت میں ہے: "لَا تَسْأَلُوْهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوْكُمْ بِحَقٍّ فَتُكَذِّبُوْا بِهٖ أَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوْا بِهٖ" (مسند احمد: مسند جابر بن عبداللہ: ۱۵۵۴۶)

"تم ان (یہود) سے کسی چیز کے بارے میں مت پوچھو، وہ تم کو حق کی خبر دیں گے تو تم اس کو جھٹلا دو گے، یا باطل کی خبر دیں گے تو تم اس کی تصدیق کرو گے"

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری ہی اتباع کرنی پڑتی، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی

شریعت سب انبیاء کی شریعتوں کے لئے ناسخ ہے، اگر پچھلے نبی بھی دوبارہ دنیا میں آجائیں تو انہیں بھی آپ ہی کی شریعت کی اتباع کرنی پڑے گی، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو اپنی شریعت کی دعوت نہیں دیں گے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کی دعوت دیں گے اور اسی کی طرف لوگوں کو بلائیں گے۔

منکرین کی دلیل سے دعویٰ کا اثبات:

ایک اہم بات یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نبی ہوتے ہوئے بھی آسمان سے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو فالو (Follow) کریں گے، اور ساری انسانیت کو پابند کریں گے کہ تم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنی ہے تو اس سے خود ختمِ نبوت کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے، وہ اس طور پر کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس امت میں تشریف لائیں گے تو بحیثیت نبی نہیں بلکہ بحیثیت امتی تشریف لائیں گے تو نبوت کے جاری رہنے کا کیا مطلب؟ کیونکہ جو نبی ہیں وہ خود امتی بن جائیں گے تو جو امتی ہے وہ نبی کیسے بن سکیں گے۔

کیا حضور کی اتباع سے حضرت عیسیٰ کی نبوت میں فرق آئے گا؟

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نبوت سلب کرلی جائے گی، اور اللہ تعالیٰ ان سے منصب نبوت لے لیں گے، اور یہ ان کی شان میں گستاخی ہوگی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ نبی رہیں گے لیکن اس امت میں آنے کے بعد ان پر نبی ہونے کی حیثیت سے جو احکام نازل کئے گئے تھے وہ اس پر عمل نہیں کریں گے، اور ان کو اس امت پر نافذ نہیں کریں گے، آپ کے دنیا میں تشریف لانے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک ملک کا وزیر اعظم کسی دوسرے ملک میں چلا جائے تو وہ اپنے عہدۂ وزارت سے معزول نہیں ہوجاتا، اور اس کی وزارت سلب نہیں کی جاتی، مگر دوسرے ملک میں

اسکے وزارتی قانون بھی نہیں چلتے، اسی طرح حضرت عیسی علیہ السلام کا نزول بحیثیتِ امام المسلمین اور خلیفۃ المسلمین کے ہو گا، وہ یہاں آکر نبوت نہیں چلائیں گے، اپنا دین اور اپنا مذہب اور اپنے مسائل نہیں چلائیں گے، بلکہ وہ خود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو فالو کریں گے، جیسے کوئی وزیر اعظم دوسرے ملک میں جانے کے بعد وہاں کے قانون کی اتباع کرتا ہے، وہاں اپنے احکام نہیں چلا سکتا بلکہ وہاں کے بادشاہ کے قوانین اس کو فالو کرنے پڑتے ہیں وہاں کے اعتبار سے اس کو چلنا پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کی شان میں اور اس کے مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس کی اپنے ملک کی حکومت اور بادشاہت ختم نہیں ہوتی، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو وہ اپنے زمانے کے اور اس وقت کے لوگوں کے تو نبی ہوں گے لیکن امت محمدیہ کے نبی نہیں ہوں گے، یہاں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے، اس امت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے سے ان کی نبوت ختم نہیں ہو گی، اور نہ اس میں کچھ فرق پڑے گا، اور نہ ان کی شان میں کوئی کمی آئے گی۔

غرض قرآن مجید میں احادیثِ مبارکہ میں وضاحت کے ساتھ اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے۔ جو آیت کریمہ میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اللہ پاک نے تین باتیں ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے ایک بات ختمِ نبوت سے متعلق ہے، جس کی کچھ تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی جارہی ہے، آیتِ مبارکہ ہے:

"مَاكَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" (الاحزاب: ۴۰)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

مشرکین کا اعتراض اور اس کا جواب:

اس آیت میں اللہ پاک نے اولا مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے، جب آپ ﷺ نے اپنے متبنی بیٹے حضرت زید بن حارثہ کی بیوی حضرت زینب سے طلاق کے بعد نکاح فرمایا تو ان مشرکین مکہ نے طعن کیا کہ محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا، اللہ پاک نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ محمد زید کے باپ نہیں ہیں، بلکہ تم مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۱۴/۱۷۳) اور زید کے باپ تو حارثہ ہیں، چنانچہ زید حقیقی بیٹے نہیں ہوئے بلکہ منہ بولے بیٹے ہوئے، اور باپ کا اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے، اور منہ بولے بیٹے کی بیوی سے بعد طلاق نکاح کرنا درست ہے، لہذا محمد ﷺ کے اپنے منھ بولے بیٹے کی سابقہ بیوی سے نکاح کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

دوسری چیز جس کا اس آیت میں ذکر ہے وہ آپ ﷺ کی رسالت ہے، جس سے متعلق کچھ عقائد اس سے پہلے ذکر کئے گئے۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں ذکر ہے وہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کا ذکر ہے، جو ہمارا موضوع ہے۔

ایک نکتہ:

ایک نکتہ یہاں غور کرنے کا یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اولا تو آپ کی اولاد کی نفی فرمائی، اور اس کے بعد رسالت کا اثبات فرمایا، اور پھر آپ کا خاتم النبیین ہونا بیان فرمایا، اس میں ربط کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب آپ کی اولاد کی نفی فرمائی کہ آپ کسی کے باپ نہیں ہیں تو یہ شبہ ہو سکتا تھا بلکہ کفار آپ کے بیٹے حضرت ابراہیم کے انتقال پر یہ

کہنے لگے تھے کہ چونکہ محمد کی اولاد نہیں رہی اس لئے ان کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، اور ان سے نجات مل جائے گی، حق تعالیٰ نے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ محمد (ﷺ) کا بیٹوں کے ذریعہ سلسلۂ نسب نہ چلے لیکن چونکہ وہ رسول ہیں، اس لئے ان کا روحانی یہ سلسلہ چلے گا۔ اور پھر آپ چونکہ خاتم النبیین ہیں اس لئے نبوت آپ پر ختم ہے اور آپ کے بعد آپ کی روحانی اولاد میں سے بھی کوئی نبی نہیں بن سکتا۔

لفظِ خاتم میں تاء کے کسرہ اور فتحہ دونوں سے ختم نبوت کا ثبوت:

اس آیت میں ختمِ نبوت کا ذکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے: وخاتم النبیین فرمایا، لفظِ خاتِم (تاء کے کسرہ کے ساتھ) کے معنیٰ ہیں: ختم کرنے والا، اور خاتَم (تاء کے فتحہ کے ساتھ) کے معنیٰ ہیں: مہر، خواہ خاتِم پڑھا جائے یا خاتَم معنیٰ و مراد ایک ہی ہے، یعنی آپ ﷺ سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے ہیں اور یہ معنی خاتِم بالکسر میں تو ظاہر ہے، اور خاتم بالفتح کے معنیٰ مہر کے ہیں چونکہ مہر کسی چیز کو بند کرنے کے بعد اس پر آخر ہی میں لگائی جاتی ہے، اس لئے اس معنیٰ کے اعتبار سے بھی اس میں ختمِ نبوت کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ (روح المعانی: ۱۴۲/۱۶) اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خاتم کا معنی مہر لگانا ہے اور جس چیز پر مہر لگائی جاتی ہے اس کو سیل کر دیا جاتا ہے، اور اس کو مکمل طریقے پر بند کر دیا جاتا ہے تاکہ کوئی اندر کی چیز باہر نہ آئے اور باہر کی چیز اندر نہ جائے، اب آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ جب آپ کے ذریعہ انبیاء کے سلسلہ پر مہر لگا دی گئی ہے تو آپ کے بعد نہ کسی اور کی نبوت جاری رہ سکتی ہے۔ اور نہ کوئی باہر والا اس نبوت میں شامل ہونا چاہے تو شامل ہو سکتا ہے۔

غرض دونوں معنیٰ کے اعتبار سے ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ آپ کی بعثت کے بعد کوئی شخص قیامت تک وصفِ نبوت سے متصف نہیں ہو سکتا، چاہے جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے ہو، آپ نے بالکلیہ اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ (روح المعانی: ۱۴۲/۱۶)

اسلوبِ قرآنی اور ختم نبوت کا ثبوت:

دوسری دلیل یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے ابتداء میں متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا: ''وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ''

وہ لوگ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی، یعنی قرآن مجید، اور ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، آیت کے اسلوب پر غور کیجئے، اس میں ''بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ'' کا ذکر تو ہے (یعنی مومنین آپ پر نازل ہونے والی کتاب اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں) لیکن حق تعالیٰ نے ''وَمَا أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِکَ'' اس طرح کا کوئی جملہ ذکر نہیں فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ آپ کے بعد اگر کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اس کا بھی ذکر ہوتا، کوئی کتاب نازل ہونے والی ہوتی تو اس کا بھی ذکر ہوتا، تاکہ بعد میں آنے والوں کے لئے کوئی شبہ باقی نہ رہے، مگر قرآن مجید کی متعدد آیات میں صرف ''من قبلک'' کی قید لگائی گئی ہے، کہیں بھی من بعدک کا ذکر ہی نہیں ہے، معلوم ہوا کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا بھی نہیں ہے۔

ختمِ نبوت کی تمثیلی دلیل:

ایک حدیث میں آپ نے مثال کے ذریعہ اس کو سمجھایا، حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلَ الْأَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَأَحْسَنَهٗ وَأَجْمَلَهٗ، إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِیَةٍ، فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَیَعْجَبُوْنَ لَهٗ، وَیَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ، وَأَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ'' (صحیح بخاری: کتاب المناقب: باب خاتم النبیین: ۳۵۳۵)

میری مثال اور پچھلے انبیاء کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے ایک محل بنایا اور بہترین محل

بنایا، اور ہر طرح سے اس کو سجایا، لیکن ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑدی، لوگ اس کے ارد گرد گھومتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ جگہ خالی ہے، آپ نے فرمایا:

"أَنَا اللَّبِنَةُ وَ أَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ" کہ وہ اینٹ میں ہوں کہ مجھ پر وہ محل مکمل کر دیا گیا اور میں خاتم النبیین ہوں۔ اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "فَأَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْأَنْبِيَاءَ" (صحیح مسلم: کتاب الفضائل: باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین، ۶۱۰۳)

پس وہ اینٹ کی جگہ میں ہی ہوں، میں آیا اور میں نے انبیاء کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اس حدیث میں مثال کے ذریعہ نبی علیہ السلام نے واضح کر دیا کہ آپ کے بعد کسی قسم کی نبوت کا امکان نہیں ہے، اگر کچھ امکان ہوتا تو اس کو بتایا جاتا اور اس کو واضح کیا جاتا، اور اس مثال میں کچھ لچک باقی رکھی جاتی، لیکن آپ نے یہ بتایا کہ جو جگہ نبوت کی تھی میرے ذریعہ وہ پُر ہو گئی، اب کسی اور کے آنے کا اس میں امکان نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی چھ خصوصیات:

ایسے ہی حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، جس میں عقیدۂ ختم نبوت کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ طَهُوْرًا وَمَسْجِدًا وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ" (صحیح مسلم: کتاب المساجد: ۱۱۹۵)

مجھے چھ چیزوں کے ذریعہ اللہ پاک نے دیگر انبیاء پر فضیلت بخشی ہے، ویسے تو آپ ﷺ کی اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں، لیکن اس حدیث میں آپ ﷺ نے خاص طور پر چھ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

جوامع الکلم کے دو مطلب:

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو جوامع الکلم دئے گئے، اور جوامع الکلم کا مطلب یہ ہے کہ کلام تو مختصر ہو لیکن کئی معانی اور کئی مضامین اپنے اندر لئے ہوئے ہو، اور آپ ہی کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ کا کلام تو مختصر ہوتا تھا لیکن اس میں کئی کئی مضامین موجود ہوتے تھے، اور کئی مسائل موجو ہوتے تھے، یہی وجہ ہیکہ محدثین نے ایک ایک حدیث سے کئی کئی مسائل مستنبط کئے ہیں۔

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا کلام اور آپ کے ارشادات جامع اور محیط ہیں، آپ کا علم حاوی ہے، زندگی کے جتنے شعبے پائے جاتے ہیں ان سب میں آپ کی کامل رہبری موجود ہے، ساری چیزوں سے متعلق آپ کی ہدایات اور آپ کے ارشادات محفوظ ہیں۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ تورات میں اقوام کی تاریخ، عقیدۂ توحید و رسالت، قربانی اور دیگر عبادات سے متعلق چند ہی مسائل اور احکام ذکر کئے گئے ہیں، زبور دعاؤں اور عبادتوں کا مجموعہ ہے، سِفرِ ایوب میں عقیدۂ تقدیر و رضا کی تعلیم ہے، امثالِ سلیمان میں مواعظ اور حکم ہیں، دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں توبہ و ندامت اور پیشین گوئیوں کے مضامین ہیں، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت اور اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات تورات بھی ہیں، زبور بھی ہیں، انجیل بھی ہیں، صحفِ ابراہیم و موسیٰ بھی ہیں، آپ کا کلام اور آپ کے ارشادات ان سب کو جامع اور محیط ہیں، اتنی جامعیت اور اتنا احاطہ کسی اور کتاب کسی اور صحیفے میں نہیں ہے۔ اس حدیث میں آپ کی یہ پہلی خصوصیت بیان کی گئی۔

حضور کا رعب اور اس کی دو خصوصیتیں:

دوسری خصوصیت آپ ﷺ نے یہ ذکر فرمائی: ''نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ'' یعنی رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے، اللہ پاک نے آپ کو ایک خاص رعب عطا فرمایا تھا، اور آپ کا یہ رعب ہر ایک پر چھا جاتا تھا، چاہے بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، دور کا ہو یا نزدیک کا، رعب کے ذریعہ آپ کی مدد کی جاتی تھی۔

آپ ﷺ کے رعب کی دو خصوصیتیں تھیں، ایک تو یہ کہ یہ رعب ایک مہینہ کی مسافت سے لوگوں کے دلوں پر اللہ پاک ڈال دیتے تھے، بعض روایت میں دو مہینوں کا ذکر ہے۔ (سنن بیہقی: جماع ابواب الصلاۃ: ۴۲۶۷)

اور بعض روایات میں اس کی تفصیل ہے: ''نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ شَهْرًا اَمَامِيْ، وَشَهْرًا خَلْفِيْ'' (المعجم الکبیر: ۶۶۷۴) آگے ایک مہینے کی مسافت اور پیچھے ایک مہینے کی مسافت سے دشمنوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ رعب ڈال دیتے تھے۔

اور یہ بالخصوص دشمنوں کے لئے تھا، جیسا کہ روایات میں صراحت ہے، ''نُصِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرَيْنِ عَلٰى عَدُوِّهٖ'' (معجم الکبیر: ۱۰۸۹۳)

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا رعب بغیر آلات اور اسباب کے تھا، کوئی ہتھیار آپ کے پاس نہیں ہوتا تھا، کوئی شان و شوکت آپ کے پاس نہیں تھی، لیکن پھر بھی دشمنوں پر یہ خوف طاری رہتا تھا، ان کے دل گھبراہٹ کا شکار رہتے تھے۔ (ذخیرۃ العقبیٰ فی شرح المجتبیٰ: ۶۰۰/۵) کوئی کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ آج بھی ایک ملک کا دوسرے ملک پر ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر رعب اور خوف ہوتا ہے، اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ کے نبی کا رعب بغیر ہتھیار اور آلات کے تھا جبکہ عام لوگوں کا خوف ان کی طاقت، قوت اور آلات و اسباب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

ایک مہینے کی مسافت سے دشمنوں پر رعب کی حکمت علماء نے یہ لکھی ہے کہ چونکہ آپ کے دشمن ایک مہینے کی مسافت پر تھے، یا بڑے بڑے ملک کم وبیش ایک مہینے ہی کی مسافت پر تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مہینے کی مسافت سے ہی آپ کا رعب ان کے دلوں پر ڈال رکھا تھا۔ (عمدۃ القاری: کتاب الجہاد: ۲/۲۲ وسبل السلام: ۱/۹۳)

وہ اتنی دور رہ کر بھی آپ سے ڈرتے تھے، اور آپ سے خوف کھاتے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان کے خلاف آپ کی مدد ونصرت فرماتے تھے، اور کامیابی آپ کے شامل حال ہوتی تھی۔ (عمدۃ القاری: کتاب الجہاد والسیر: ۲/۲۲)

دشمنوں پر تو یہ رعب تھا ہی لیکن صحابہ کرام پر بھی ایک طرح کا رعب چھایا ہوا ہوتا تھا، کسی صحابی کو بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی، آپ کو اگر کوئی اچانک دیکھتا تو اس پر آپ کا رعب چھا جاتا، پھر جب آپ سے گھل مل جاتا تو مانوس اور محبوب ہو جاتا، ''مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهٗ وَمَنْ خَالَطَهٗ مَعْرِفَةً أَحَبَّهٗ '' (سنن ترمذی: کتاب المناقب: باب ماجاء فی صفۃ النبی: ۳۹۹۹)

آپ کی عظمت کے اثر سے اور آپ کے رعب اور آپ کی ہیبت کی وجہ سے صحابہ سر نہیں اٹھاتے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، ''كَأَنَّ عَلٰى رُؤُسِنَا الطَّيْرَ لَا يَتَكَلَّمُ مِنَّا اَحَدٌ'' (کنز العمال: ۳۶۳۵۱)

ایسے بے شمار واقعات ہیں جن میں آپ کے رعب اور اس کے اثر کو بیان کیا گیا ہے، یہ آپ کی دوسری خصوصیت تھی، جو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کو عطا فرمائی تھی۔

امتِ محمدیہ کے لئے مالِ غنیمت کی حلت اور اس کی وجہ:

تیسری خصوصیت اللہ پاک نے آپ کو یہ عطا فرمائی کہ مال غنیمت آپ کے لئے حلال کر دیا گیا، آپ نے فرمایا: ''اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ'' مالِ غنیمت میرے لئے حلال کر دیا گیا، پچھلی امتوں میں لڑائی کے بعد جب دشمنوں کا مال ہاتھ آتا تو اس کو استعمال کرنے کی

اجازت نہیں تھی، بلکہ ان کو حکم یہ تھا کہ اس مال کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے، آسمان سے آگ آئے گی اور اس کو کھالے گی، اگر آگ اس کو کھاجاتی تو وہ قبول ہونے کی علامت ہوتی، اور اگر آگ اس کو نہ کھاتی تو وہ قبول نہ ہونے کی علامت ہوتی، لیکن بطورِ معجزہ آپ کے لئے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا گیا، اور ظاہر ہے کہ اس میں حضور کی امت پر شفقت اور عنایت بھی ملحوظ ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس کو حلال کر دیا، اور اسے استعمال کرنے اور کھانے کی اجازت دیدی۔ (صحیح بخاری: فرض الخمس، باب احلت لی الغنائم: ۳۱۲۴)

چوتھی خصوصیت:

چوتھی خصوصیت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی: ”جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا“ ساری زمین کو میرے لئے مسجد اور پاکی کا ذریعہ بنایا دیا گیا، یعنی طہارت حاصل کرنے کے لئے زمین کو پانی کے قائم مقام بنایا دیا گیا، پچھلی امتوں میں عبادت کی جگہ مخصوص ہوتی تھی ہر جگہ عبادت نہیں کی جاسکتی تھی، ان کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ اپنے گرجا گھروں اور اپنی عبادت گاہوں اور اپنے محرابوں میں نمازیں ادا کیا کریں۔

”وَكَانَ مِنْ قَبْلِنَا يُصَلُّوْنَ فِي الْمَحَارِيْبِ“ (المعجم الاوسط: ۷۴۷۱)

لیکن اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ ساری زمین اس کے لئے مسجد ہے، جہاں چاہے نماز ادا کر سکتی ہے، کوئی جگہ اس کے لئے محدود نہیں ہے۔ (معالم السنن: ۱/۱۴۶)

اس خصوصیت میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ پاک نے ساری زمین کو پاک قرار دیا اور اس سے تیمم کر کے پاکی حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔

البتہ بعض روایات سے ایک اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں چاہے نماز پڑھتے تھے تو اس میں آپ کی کیا خصوصیت رہی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے لئے

ساری زمین کو مسجد بنایا گیا تھا، اور ساری زمین کو پاک بنایا گیا تھا اور اس سے پاکی حاصل کرنے کی اجازت تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف جہاں چاہے نماز پڑھنے کی تو اجازت تھی لیکن زمین سے پاکی حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔(شرح ابن بطال: ۵/۲۔وعمدۃ القاری: ۳۵/۶) غرض یہ آپ کی چوتھی خصوصیت تھی جس کے ذریعہ اللہ پاک نے آپ کو دیگر انبیاء پر فضیلت بخشی۔

پانچویں خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں خصوصیت ہے: ''اُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّةً'' کہ آپ کو پوری مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا، یہ صرف آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ ہر نبی مخصوص علاقہ مخصوص زمانے اور مخصوص لوگوں کے لیے بھیجے جاتے تھے، لیکن آپ کو سارے عالم کے لئے اور قیامت تک کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا۔

چھٹی خصوصیت:

آپ کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو خاتم النبیین بنایا گیا، اور اسی مقصد سے یہ حدیث آپ کو سنائی گئی، چونکہ ابتداء میں آپ کی دیگر خصوصیات بیان کی گئیں، اس لئے اس کی بھی کچھ تفصیل ذکر کی گئی، اصل مضمون تو ختم نبوت کا چل رہا تھا، جو اس حدیث کے آخری جزء میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ چھ خصوصیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہیں، آپ کے علاوہ کسی اور نبی کو عطا نہیں کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، اگر آپ کے بعد کسی اور کو نبی مانیں تو یہ آپ کی خصوصیت کہاں رہے گی، آپ کی افضلیت کیسے باقی رہے گی؟ بلکہ اس سے نبی کی خصوصیت کا انکار لازم آتا ہے۔

اس صورت میں آپ کے آخری نبی ہونے کا کیا مطلب ہو گا؟ آپ کے ساری انسانیت کیلئے رحمۃ للعالمین ہونے اور آپ کے ساری انسانیت کے لئے نبی بنا کر بھیجے جانے کا کیا مطلب ہو گا؟ اس عقیدہ سے کتنی بڑی خرابی لازم آئے گی، قرآن و حدیث کے تقریبا تین سو دلائل کو جھٹلا کر نعوذ باللہ! اللہ اور رسول کے مقابلے میں مرزا غلام احمد قادیانی کو سچا ماننا لازم آئے گا۔

نبی کی خصوصیات کسی اور میں تسلیم کرنا بھی مستلزمِ کفر ہے:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو چیزیں نبی کے ساتھ خاص ہوں ان کو کسی اور شخص کے لئے تسلیم کرنا بھی غلط ہے، بلکہ کفر کو مستلزم ہے، جیسے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو مُحَلِّل (کسی چیز کو حلال کرنے والا) اور مُحَرِّم (کسی چیز کو حرام قرار دینے والا) سمجھنا، بلکہ نبی بھی جس چیز کو حلال یا حرام قرار دیتے ہیں تو وہ بھی اللہ کی اجازت اور من جانب اللہ وحی کی بنیاد پر۔ اس لئے اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے پیر و شیخ حلال و حرام کا اختیار رکھتے ہیں، حلت و حرمت ان کے اختیار میں ہے، وہ جس کو حلال کہیں وہ حلال ہے، اور وہ جس کو حرام کہیں وہ حرام ہے، جس کو وہ واجب کہیں وہ واجب ہے، تو یہ بھی کفریہ عقیدہ ہے، یہ حلت و حرمت کا بیان نبی کے فرائضِ منصبی میں سے ہے، اس کا اختیار کسی اور کو نہیں ہوتا، اور اس میں کسی کو عمل دخل کا حق نہیں ہوتا۔ اور ائمہ مجتہدین کی طرف جو حلت و حرمت منسوب ہوتی ہے کہ فلاں امام فلاں چیز کو حرام اور فلاں چیز کو حلال بتاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے استخراج کے ذریعہ بتاتے ہیں، نہ کہ اپنی طرف سے۔

غرض جو چیزیں نبی کے ساتھ مخصوص ہوں ان کو کسی اور کے لئے تسلیم کرنا بھی مستلزمِ کفر ہے، چونکہ وحی نبوت کی خصوصیت ہے اس لئے اب اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں

بھی صاحبِ وحی ہے ،فلاں پر بھی وحی آتی ہے تو ایسا شخص بھی کافر اور مرتد ہے، ایسا دعویٰ کرنے والا بھی کافر ہے اور اس کو ماننے والے بھی کافر ہیں،اس لئے ایسے لوگوں سے اور ان کی گمراہی اور ضلالت سے اور ان کے دھوکہ سے اپنے آپ کو اور اپنی نسل کو بھی بچانے کی ضرورت ہے،اوران سے بہت ہی محتاط رہنے کی ضرورت ہے،ایسے لوگوں کی اسلام کے نام پر بہت ساری ویب سائٹس بھی ہیں،عام آدمی کے لئے اس کو پہچاننا بھی مشکل ہوتا ہے،کیونکہ وہ بھی کلمہ پڑھتے ہیں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، قرآن وحدیث کا ہی حوالہ دیتے ہیں، اس لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ اسلام کے نام پر بنائی جانے والی ہر ویب سائٹ اسلام کی صحیح ترجمانی کرے،ضروری نہیں ہے کہ مساجد میں رکھا جانے والا ہر ترجمہ قرآن صحیح ہو، وہاں رکھا جانے والا لٹریچر اور گھروں تک پہنچایا جانے والا لٹریچر سب کے سب صحیح ہوں ، اس لئے اہل حق علماء سے رجوع ہو کر اپنے مسائل معلوم کریں، یا مستند اہل حق کی ویب سائٹس معلوم کر کے ان سے اپنے مسائل کو حل کریں اور قرآن و حدیث کی رہنمائی لیں، اس قسم کے فتنے پھیلانے والا اور اسلام کے نام پر دھوکہ دینے والا صرف ایک ہی گروپ نہیں ہے، بلکہ کئی گروپ ہیں اور پوری دنیا میں یہ پھیلے ہوئے ہیں، یہ دشمنوں کے پروردہ ہیں، مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اور آپ کو اور ساری امت مسلمہ کو ایسے باطل فرقوں اور باطل عقیدوں سے اور ان کی ضلالت و گمراہی سے محفوظ رکھے، اور ہمارے عقائد کو درست فرمائے۔(آمین)

ختمِ نبوت کے تقاضے اور چند باطل فرقوں کا تعارف

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ”مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا“ (الاحزاب: ۴۰)

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

آیتِ مبارکہ کے دو پہلو:

برادرانِ اسلام!

اس سے قبل عقیدۂ ختمِ نبوت پر چند باتیں آپ کے سامنے بیان کی گئیں تھیں، آج بھی چند باتیں اسی ضمن میں ذکر کرنے کا ارادہ ہے، خطبہ میں جو آیتِ مبارکہ میں نے پڑھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا ذکر کیا ہے، اس آیت کا روئے سخن دو قسم کے افراد کی جانب ہے، ایک تو وہ افراد جو آپ کو آخری نبی نہیں مانتے اور نبوت کی تقسیم کر کے کسی اور کو بھی نبی مانتے ہیں تو یہ آیتِ مبارکہ ان کی تردید کرتی ہے۔ اس کی تفصیل اس سے پہلے آپ کے سامنے ذکر کی گئی ہے۔

خاتمیتِ محمدی کی جامعیت:

دوسرا مضمون اس آیت میں یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے بارے میں یہ بتادیا گیا کہ آپ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی دنیا میں مبعوث نہیں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے زندگی کے جس شعبہ میں جو تعلیم دی وہ آخری ہے، اس سے بڑھ کر کوئی تعلیم نہیں، اس سے اعلیٰ اور فائق کوئی تعلیم نہیں، آپ ﷺ کا کلچر آخری کلچر ہے، آپ کی تہذیب آخری تہذیب ہے، آپ کا طریقہ آخری طریقہ ہے، آپ کا طرزِ زندگی آخری ہے، آپ کی نشست وبرخاست آخری ہیں، قیامت تک یہ سب جاری رہیں گے، اور قیامت تک انہیں ہی فالو کرنا پڑے گا، کسی اور کی تہذیب، کسی اور کا تمدن، کسی اور کا کلچر، کسی اور کے زندگی گزارنے کا طریقہ لغو اور بے کار ہے۔ اور جس کو ہم اعلیٰ سمجھتے ہیں تو وہ دھوکہ ہے۔

غیرِ اسلامی کلچر سے متاثر ہونا ختم نبوت کو نہ سمجھنا ہے:

ہمارے کلچر میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا فیشن ہے، عورتوں کا نیم برہنہ ہو کر پھرنا اور غیر محرم عورتوں سے آزادانہ تعلقات قائم کرنا عزت ہے، اگر کوئی ایسے کلچر کو اپناتا ہے، ایسی تہذیب کو اختیار کرتا ہے اور کسی اور کی تعلیم کو اپنا مقصد بنالیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ اس کے دماغ میں مستحضر نہیں، اگر آپ ﷺ کی تعلیم کو وہ آخری تعلیم، جامع تعلیم، انفع تعلیم، عزت والی تعلیم مانتا تو کسی اور کے پاس جاتا ہی نہیں، اگر آپ کے کلچر کو آخری کلچر مانتا اور آپ کی تہذیب کو آخری تہذیب مانتا اور آپ کے طریقے کو آخری طریقہ سمجھتا تو کسی اور کلچر کو نہ اپناتا، کسی اور کی تہذیب کو اختیار نہ کرتا کسی اور کے طریقے پر نہ چلتا، میرے دوستو! حضور کا کلچر آخری کلچر ہے، اسی میں جامعیت ہے، اسی میں نافعیت ہے، اسی میں عزت ہے، اور اس معاملہ

میں غیر شعوری طور پر مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ متاثر ہو گیا ہے، در اصل ہم کلچر کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے، تہذیب و تمدن کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے، رہائش اور طرزِ زندگی کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے، بود و باش اور تقریبات کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے، یہ سب دین کے حصے ہیں، خوشی کے اظہار کا ایک انداز ہے، غم کے اظہار کا ایک انداز ہے، رہنے سہنے کا ایک انداز ہے، پہننے اوڑھنے کا ایک انداز ہے، حضور اکرم ﷺ کی رہبری ان سب میں موجود ہے، اگر بالفرض رہبری نہ ہوتی تو آپ کی رہبری ناقص و نامکمل ناتمام ہوتی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" (المائدہ:۳)

"آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمھارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا"

جب دین مکمل کر دیا گیا تو ہر چیز میں آپ کو رہبری ملے گی، پس جب رہبری موجود ہے اور مسلمان اس کو قبول نہیں کرتا ہے، تو پھر اس نے خاتم النبیین کو کیا سمجھا؟ اگر خاتم النبیین ہونا اس نے سمجھا ہوتا تو اس کی زندگی پر اس کا بڑا اثر ہوتا، عقیدوں کے اندر اس کا اثر پڑتا، عبادات میں اس کا اثر پڑتا، تہذیب اور تمدن میں اس کا فرق پڑتا، زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا اثر پڑتا۔

بدعت خاتمیتِ نبی کے منافی ہے:

اسی طرح آپ ﷺ نے جو عبادات اور جو طور طریقے ہم کو سکھلائے ہیں اس میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہو سکتا، اسی کا نام بدعت ہے، اسی لئے بدعت کی قباحت بارہا بیان کی جاتی ہیں اور بارہا اس سے روکا جاتا ہے، در اصل بدعت سنت کی ضد ہے اور ظاہر ہے کہ سنت کے مقابلہ میں جو چیز بھی آئے گی خواہ کتنی ہی حسین و جمیل شکل میں ہو اور

کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو وہ عند اللہ مقبول نہیں، جب آپ عبادتوں میں خاتم النبیین ہیں تو نیکی کا کوئی طریقہ آپ ایسا اختیار نہیں کرسکتے جو حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہو، اگر آپ کے طریقے کے خلاف ہم کوئی چیز نکالتے ہیں تو پھر وہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہے، جب ہم نے نئی چیز پیدا کرلی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے طریقوں، آپ کی عبادتوں اور آپ کی تعلیمات کو ہم نے آخری نہیں سمجھا، اگر سمجھے ہوتے تو اس بدعت کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس کو کیوں ایجاد کیا گیا؟ بلکہ بدعت سے تو دین کا ناتمام ہونا نبی کی تعلیمات کا ناتمام اور ناقص ہونا لازم آتا ہے، نعوذ باللہ! نبی کی تعلیمات کو کافی ووافی نہ سمجھنا لازم آتا ہے، بلکہ نعوذ باللہ فریضہ رسالت میں نبی کی کوتاہی سمجھ میں آتی ہے، اگر ہم نبی کی تعلیمات کو آخری سمجھتے، کامل اور مکمل سمجھتے، کافی ووافی سمجھتے تو بدعتوں کو کیوں ایجاد کرتے؟ غرض عبادات میں جب آپ ﷺ کو خاتم النبیین مان لیا گیا تو اب عبادت کا نیا طریقہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہے۔

خاتمیت معاملات اور معاشرت کو بھی حاوی ہے:

ایسے ہی معاملات میں بھی آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، لہٰذا آپ نے معاملات کے جو طریقے، خرید وفروخت کے جو طریقے، کاروبار کے جو طریقے اور احکام بتائے ہیں ان کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، ان میں کمی بیشی نہیں کی جاسکتی، ان کی خلاف ورزی کرنا گویا آپ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہے۔ اخلاقیات، معاشرت اور طرزِ زندگی میں بھی آپ خاتم النبیین ہیں، عورتوں اور مردوں کے حقوق، ماں باپ اور اولاد کے حقوق، بھائیوں اور بہنوں کے حقوق، دوستوں اور پڑوسیوں کے حقوق، استاذ اور شاگردوں کے حقوق، پیروں اور مریدوں کے حقوق سب معاشرت سے تعلق رکھتے

ہیں، اس میں آپ کی تعلیمات آخری ہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوراوڑھنے میں آپ کی تعلیمات آخری ہیں، خاتم النبیین کے مضمون میں یہ سب شامل ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنا گویا عقیدۂ ختم نبوت کو نہ سمجھنا ہے۔

ہماری یہی نا سمجھی کی وجہ سے ہم آسانی سے آپ کی تعلیمات کو چھوڑ دیتے ہیں، آپ کی سنتوں کو چھوڑ دیتے ہیں، اور غیروں کی تہذیب کو اپنا لیتے ہیں، ان کے طور طریقوں کو اپنا لیتے ہیں، ان کے طریقے ہم کو اچھے لگتے ہیں۔

یاد رکھیں کہ حضور کا طریقہ آخری طریقہ ہے، کامل طریقہ ہے، عزت والا طریقہ ہے، اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ قابلِ قبول نہیں، اور نہ کسی مسلمان کے لئے زیبا ہے۔

سنتِ رسول ہمارے لئے فخر کا باعث ہے:

مسلمانوں کے لئے آپ ﷺ کا طریقہ اور آپ کی سنتیں عزت، افتخار اور خوشی کا باعث ہیں، لیکن ہم ان پر عمل کرنے میں شرماتے ہیں، اگرچہ شرمانا دوسروں کو چاہیے، لیکن ہم شرمانے لگتے ہیں، ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے سنت کے موافق کھالیا اور پی لیا اور پہن لیا تو ہماری حیثیت کیا ہو جائے گی؟ ہمارا مقام گھٹ جائے گا، ہم بے عزت ہو جائیں گے، ہمارا حال، ہماری سوچ اور فکر اس طرح کی بن گئی ہے، جب کہ سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے دنیا اور آخرت دونوں میں عزت ملتی ہے، اور جو سنت کو چھوڑ کر اپنی حیثیت بنانے کی کوشش کرتا ہے، تو جا کر دیکھے کہ پوری دنیا میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا مقام ہے؟

مسلمانوں کی بے عزتی کا سبب:

آج پوری دنیا میں مسلمان کی بے عزتی سنتوں کو چھوڑنے کی وجہ سے ہے، کسی کا جھوٹا چاٹ کر اور اندھی تقلید کر کے اس کے پیچھے جانے سے کیا آپ کو عزت ملے گی؟

نہیں؛ بلکہ ذلیل ہو جائیں گے، ہماری سب سے بڑی ذلت یہی ہے کہ ہم اپنے پاس اپنی تہذیب اور اپنا طور طریقہ اور اپنا مذہب رکھنے کے باوجود کسی اور کے طریقہ کو اپناتے ہیں، جب دوسرے مذہب والے دیکھیں گے کہ یہ تو فلاں مذہب کا ہے لیکن ہمارے پیچھے پڑا ہے تو غور کریں کہ اس میں ہماری عزت ہو گی یا ذلت؟ اس کے بجائے اگر ہم اپنے طور طریقوں کو اپنائیں گے تو لوگ ہم کو عزت سے دیکھیں گے کہ فلاں اس مذہب سے تعلق رکھتا ہے، اس کے اخلاق کتنے اچھے ہیں؟ اس کی عادتیں کتنی اچھی ہیں؟ اس کی تعلیمات کتنی پیاری ہیں؟ ہم نے اپنے طور طریقوں کو چھوڑ کر خود کو بے عزت کر لیا ہے، اس میں اپنی تو بے عزتی ہے ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے بڑوں اور اپنے اکابر کی بھی بے عزتی اور بدنامی ہے، غیروں کے طریقوں پر عمل کر کے گویا ہم اپنے بڑوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہمارے بڑوں نے ہم کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ نہیں کیا۔ ہماری تربیت صحیح نہیں کی، ہم کو دین نہیں سکھلایا۔

لیکن ایک بات یہ بھی سن لیں کہ آگے چل کر انسانوں کو پھر اسی نبوی راستے ہی پر آنا ہے، ساری دنیا گھوم پھر کر، سر مار کر، ہر جگہ ٹھوکر کھا کر، ذلت اور رسوائی سے دوچار ہو کر جناب رسول اللہ ﷺ کی غلامی ہی میں آئے گی، آپ ہی کے دامنِ رحمت میں اسے پناہ ملے گی، آخر وہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ کامیاب زندگی تو وہی ہے، راحت اسی میں ہے، سکون اسی میں ہے، امن اسی میں ہے، عزتوں کی حفاظت اسی میں ہے، جانوں کی حفاظت اسی میں ہے، مالوں کی حفاظت اسی میں ہے، انسانیت کی حفاظت اسی میں ہے، اور انسانوں کے حقوق اور تقاضوں کی رعایت اسی میں ہے۔

غرض یہ عقیدہ اسلامی عقائد میں بہت اہم عقیدہ ہے، اس کا اثر دین کے سارے شعبوں پر پڑتا ہے، اور اس وقت بہت سے ایسے فرقے پائے جاتے ہیں جو اس عقیدہ میں اور اس

کے علاوہ دوسرے اہم عقائد میں گڑبڑی کرتے ہیں، اور اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں، بلکہ غیر مسلم اور مرتد بنانے کی کوششیں کر رہے ہیں، اس لئے ان سے تحفظ کے پیش نظر کچھ تفصیل قادیانی فرقہ سے متعلق آپ کے سامنے ذکر کی گئی، اس کے علاوہ اور بھی فرقے ہیں، ان کا مختصر تعارف بھی آپ حضرات کے سامنے کرنا ضروری ہے۔

ان فرقوں میں سے ایک فرقہ پرویزی فرقہ ہے۔ صدیق دینداروں کا فرقہ ہے، فرقۂ نیچریہ ہے، فرقۂ چکڑالویہ ہے، فرقۂ آغاخانیہ ہے، بوہری فرقہ ہے۔

فرقۂ نیچریہ کی بنیادی غلطی:

جب اسلامی حکومت کا زوال ہوا اور ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی، اُس وقت سب سے پہلے پیدا ہونے والا فرقہ "نیچریہ" ہے، فرقہ نیچریہ کے نام سے دو فرقے پائے جاتے ہیں، ایک فرقہ دہریہ کہلاتا ہے، فرقۂ دہریہ غیر مسلم ہی ہیں، یہاں پر وہ مراد نہیں ہیں، بلکہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے جدید دنیاوی علوم حاصل کرنے کے بعد احکامِ شریعت کو قبول کرنے کے لیے اپنی عقل کو معیار بنایا اور مغربی تہذیب وتمدن کو حق وباطل کا اور اچھے وبُرے کا مدار ٹھہرایا، یعنی جو مغرب میں اچھا ہے وہ اچھا ہے اور جو اُن کے پاس بُرا ہے وہ بُرا ہے۔ اور جو چیز مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف ہو وہ چیز اُن کے نزدیک درست نہیں۔ شریعت کی جو باتیں اُن کے عقل میں آجائیں وہ حق ہیں، اور جو اُن کی عقل میں نہ آئے وہ اُن کے پاس قابلِ قبول نہیں ہے، چاہے اُس کا ذکر قرآن وحدیث ہی میں کیوں نہ ہو۔

در اصل یہ ذہنیت فرقۂ خوارج اور معتزلہ کی ہے، ان کی بھی بنیاد یہی تھی۔ آپ کو اس سے پہلے بتایا گیا تھا کہ فرقۂ معتزلہ فلسفۂ یونان سے متاثر ہو کر وجود میں آنے والا فرقہ

ہے۔ علمِ لاجک (ہر بات کی عقلی توجیہ) سے متاثر ہو کر پیدا ہونے والے فرقوں میں یہی بات تھی کہ اگر بات ان کی عقل اور سمجھ میں آتی تو وہ مانتے ورنہ نہیں، لیکن ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی بات چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کو ماننا ضروری ہے، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ہر بات تو عقل کے موافق ہوتی ہے، لیکن ہر آدمی کی عقل اس کے موافق نہیں ہوتی۔ جو جزوی عقل ہے، جو ناقص عقل ہے، جو چھوٹی عقل ہے، جو غیر تربیت یافتہ عقل ہے اُس کو یہ باتیں کیسے سمجھ میں آئیں گی، بلکہ کامل عقول اس کے موافق ہوں گی، اور وہ انبیاء کی عقول تھیں، وہ اُن کے خلفاء کی عقول تھیں، وہ اُن کے تربیت یافتہ لوگوں کی عقول تھیں، یہ لوگ کامل عقل والے کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناقص جزوی اور چھوٹی عقل کو لے کر کیا سمجھیں گے؟

فرقۂ نیچریہ کے موجد:

اس فرقہ کے موجد علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں ہیں، ''تفسیرِ حقانی'' کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی صاحب نے بہت تفصیل سے سرسید احمد خاں کا رَد کیا ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حقانی صاحب کی کتابوں کے حوالہ جات اور اقتباسات کے ساتھ ایک تفصیلی جدول تیار کیا جو کئی صفحات پر مشتمل ہے، جس میں بتایا کہ یہ تمام عقیدے قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ فرقے والے محرفین قرآن اور محرفینِ دین میں سے ہیں۔

فرقۂ نیچریہ کے چند باطل نظریات:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''امداد الفتاویٰ'' کی چھٹی جلد میں ان کے عقائد کو ایک جدول کے ساتھ نقل کر کے مختصراً اس کا رد کیا ہے۔ ان کے چند نظریات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) یہ لوگ انبیاء کرام کے معجزات کا اور اولیاءِ کرام کی کرامت کا انکار کرتے ہیں۔

(۲) ملائکہ، شیطان اور جنت کے درخت کا انکار کرتے ہیں۔

(۳) عذاب قبر کا انکار کرتے ہیں۔

(۴) جغرافیہ میں نہ ہونے کی وجہ سے جنت کا انکار کرتے ہیں۔

(۵) قیامت کا، حشر کا، حساب کا، عذاب اور ثواب کا انکار کرتے ہیں۔

(۶) مسئلہ تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔

(۷) گزشتہ کتابوں میں تحریف نہیں مانتے ہیں۔

(۸) سب موحد بلکہ منکر توحید کو بھی نجات یافتہ مانتے ہیں۔

(۹) آسمانوں کا وجود نہیں مانتے۔

(۱۰) اجماع کو حجت نہیں مانتے۔

(۱۱) قرآن میں نسخ نہیں مانتے۔

(۱۲) ہر آدمی کو غیر منصوص مسائل میں مجتہد مانتے ہیں۔

(۱۳) آپ کے بعد خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۱۴) حیوانات کی تصاویر کو حلال قرار دیتے ہیں۔

(۱۵) شراب اور خنزیر کو حلال قرار دیتے ہیں۔

(۱۶) صحیح احادیث کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۷) اصحاب فیل پر سنگ باری کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۸) جنات کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۹) سحر کی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔

(۲۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے اثر کو تخیل کا اثر اور مسمریزم قرار دیتے ہیں۔

(۲۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا دعویٰ کرتے ہیں اور رفع الی السماء کا انکار کرتے ہیں۔

(۲۲) بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا انکار کرتے ہیں۔

(۲۳) معجزہ شق القمر کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۲۴) آخری زمانے میں حضرت مہدی کے ظہور کا انکار کرتے ہیں۔

(۲۵) سابقہ انبیاء کو فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی اور توحید میں ناقص مانتے ہیں۔

(۲۶) کتوں کو پاک قرار دیتے ہیں۔(امداد الفتاویٰ: ۱۷۰ تا ۱۸۲)

(۲۷) قرآن کریم میں اور احادیثِ مبارکہ میں بے جا تاویل کرتے ہیں، اور اتنی تاویل کرتے ہیں کہ درجۂ تحریف سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ یہ داڑھی کیا ہے، یہ ٹوپی کیا ہے، یہ کرتہ پاجامہ کیا ہے۔ اس طرح کے اثرات جو دیکھنے میں آتے ہیں وہ اسی جدید تہذیب اور نیچریت کے اثرات ہیں۔ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد سب سے پہلے یہی فرقہ پیدا ہوا، یہ لوگ فرقہ نیچریہ کہلائے جاتے ہیں۔ ان کو لامذہبیہ بھی کہتے ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں فرقۂ نیچریہ کا اثر:

موجودہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر فرقۂ نیچریہ اور فرقہ قرآنیہ کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے۔ جدید علوم کے لیے، اور لوگوں کی نوکریوں کے لیے سرسید احمد خاں نے بڑا کام کیا، بہت اعلیٰ ظرف تھے، لوگوں میں ان کی مقبولیت بھی ہوئی، لیکن لوگوں نے اُن کے عقیدے پر اور دینی ذہنیت پر غور نہیں کیا، اور نہ اُس طرف توجہ کی۔

فرقۂ نیچریہ کے بارے میں علماءِ حرمین کا فتویٰ:

جب سرسید احمد خاں کی کتابوں کے حوالے سے عقائد لکھ کر علمائے حرمین کو بھیجے گئے تو علمائے حرمین نے اُن کے جواب میں یہ فتویٰ دیا تھا:

"اِعْتِقَادُہٗ فَاسِدٌ وَالْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی اَھْوَنُ حَالًا مِّنْہُ ضَالٌّ مُضِلٌّ ھُوَ خَلِیْفَۃُ اِبْلِیْس"

”یہ سارے عقیدے فاسد ہیں اور یہود و نصاریٰ حال کے اعتبار سے ان سے کم تر ہیں ایسے عقیدے والا آدمی گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے اور یہ آدمی ابلیس کا خلیفہ ہے“ علمائے حرمین نے اپنے اس فتوے پر دستخط کیے اور آخر میں لکھا: ”یُکَفَّرُ لِھٰذَا الْاِعْتِقَادِ“، ایسے عقیدے والے کی تکفیر کی جائے گی۔ اور اس فتویٰ میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں مذاہب کے علماءِ کرام کے دستخط موجود ہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۱۸۳/۶ و ۱۸۴)

فرقۂ چکڑالویہ:

ایک فرقہ فرقۂ چکڑالویہ کہلاتا ہے۔ اس فرقے کا بانی عبد اللہ چکڑالوی تھا، یہ لوگ اپنے آپ کو ”اہلِ قرآن“ کہتے ہیں۔ اور احادیث رسول ﷺ کا انکار کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں دکن میں بھی ایک فرقہ اہل قرآن کا پایا جاتا ہے لیکن اس کا بانی دوسرا شخص ہے۔

ان کے ہاں حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ احادیث ڈھائی سو سال کے بعد لکھی گئیں، اس میں صحیح اور غلط حدیثیں شامل کر دی گئیں، لوگوں نے اس میں من گھڑت حدیثیں بھی ملالیں، اس پر عمل کرنا مشکل ہے، صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہے، نیز اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمایا: ”اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ“ حکم تو صرف اللہ ہی کا مانا جائے گا، رسول اللہ ﷺ کا حکم نہیں مانا جائے گا، (نعوذ باللہ من ذالک)۔ لہذا اب احادیثِ رسول کا اعتبار نہیں ہو گا۔

کتابتِ احادیث کا مبدا:

پہلی بات یہ کہ احادیث مبارکہ دو، ڈھائی سو سال کے بعد لکھی گئیں ہیں یہ دعویٰ ہی غلط ہے، کیونکہ احادیثِ مبارکہ حضور ﷺ کے زمانے ہی سے لکھی جاتی تھیں، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ یہ احادیث لکھتے تھے، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مجھ

سے زیادہ حدیثیں انہیں یاد ہیں، کیونکہ وہ حدیثیں لکھتے تھے، اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کے پاس بھی نوشتۂ رسول تھے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو احادیث لکھنے کا بھی حکم دیا تھا، پھر سنہ ۱۰۱ ہجری سے تو باضابطہ لکھنے کا آغاز ہو گیا تھا، اس کے بعد سے مستقل طور پر محدثین نے کتابیں لکھیں، تو کیسے یہ دو ڈھائی سو سال کے بعد لکھی گئیں۔

صحابہ اور محدثین کے حافظے کرامات سے کم نہیں:

دوسری بات یہ ہے کہ اس سے قطعِ نظر کہ کتابتِ حدیث کا رواج تو پہلے ہی سے تھا اللہ پاک نے ان محدثین اور ان صحابہ کرام کو جو حافظہ دیا تھا دنیا اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی، اور ان کے واقعات کتابوں میں محفوظ ہیں، اور عقل ان کو سن کر دنگ رہ جاتی ہے، بلکہ ان کے حافظے کرامات سے کم نہیں تھے، اس کے علاوہ ان کا زہد، ان کی عبادت ان کا تقویٰ، طہارت، پاکیزگی، ایمانداری، خدا ترسی، احادیثِ رسول کو بیان کرنے میں احتیاط اس قدر تھی کہ اندازہ نہیں کر سکتے، اس طرح انہوں نے اپنے سینوں میں اس کو محفوظ رکھا اور سینہ بسینہ پہنچاتے رہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کا شبہ اور اختلاط نہیں۔

ائمۂ اسماء الرجال کا امت پر احسان:

تیسری بات یہ ہے کہ ان محدثین نے اسماء الرجال کا جو فن مدون کیا تو اس سے کھرے کھوٹے میں تمیز کر دی، صحیح اور غلط میں تمیز کر دی، حق اور باطل میں تمیز کر دی، ضعیف اور موضوع روایات کو چھانٹ دیا، ایک ایک راوی کی ان لوگوں نے تحقیق کی، اس کے اساتذہ، اس کے شاگرد، اس کا بچپن، اس کا ادھیڑ پن، اس کا بڑھاپا، اس کے احوال، اس کی عادات، اس کی صفات، اس کا حافظہ، اس کی عدالت، اس کی ثقاہت، اس کا جھوٹ، اور اس کا سچ ہر ہر چیز کی ان محدثین نے تحقیق کی، اور اس کے بعد

حکم لگایا کہ اس سے روایات لے سکتے ہیں یا نہیں، وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں، اس کی روایتیں قبول کی جائیں گی یا نہیں، بڑھاپے میں وہ حدیث بیان کرنے کے قابل تھا یا نہیں، اس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا یا نہیں، وغیرہ وغیرہ، اتنی احتیاط کے ساتھ ان لوگوں نے احادیث کو مدون کیا، اور اس کے ذخیرہ کو امت کے سامنے پیش کیا، اس لئے جو احادیث کا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے وہ صحیح اور غلط، حق اور باطل کے امتیاز کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے، اس لئے ان میں جو احادیث صحیح ہیں ان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

ان الحکم الا للہ کا جواب:

رہا ان کا یہ کہنا کہ اللہ پاک نے صرف اپنے حکم کو قابلِ اتباع قرار دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حکم دیا ہے وہ در اصل اللہ ہی کا حکم ہے، آپ نے اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیا ہے، کیونکہ آپ جو بھی بات کہتے ہیں تو وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ وہ من جانب اللہ وحی ہوتی ہے:

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى"

آپ ﷺ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ وہ تو نری وحی ہوتی ہے۔

لہٰذا جب نبی کا حکم اللہ کا حکم ہوتا ہے، نبی کی بات اللہ کی بات ہوتی ہے، اللہ کی وحی نبی کی زبان سے امت کے سامنے آتی ہے تو رسول کے حکم کو ماننا اللہ ہی کے حکم کو ماننا ہے۔ دونوں کوئی الگ الگ نہیں ہیں، دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قران مجید میں فرمایا:

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ" (النساء: ۸۰ و ۸۱)

جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلق می عبد اللہ بود

اُن کا کہا ہوا اللہ تعالیٰ ہی کا کہا ہوا ہوتا ہے، اگرچہ عبد اللہ کے حلق سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے باضابطہ اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیا، اللہ پاک نے فرمایا:

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" (الحشر:۷)

"اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو"

"قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ" (آل عمران:۳۲)

(اور) آپ (یہ بھی) فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔ پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ اعراض کریں سو (سن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" (النساء:۵۹)

"اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو"

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ" (الانفال:۲۰)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا، اور اس کا (کہنا ماننے) سے روگردانی مت کرو اور تم (اعتقاد سے) سن تو لیتے ہی ہو"

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" (النحل:۴۴)

"اور ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان پر ظاہر کر دیں" (بیان کر دیں)

ان آیات میں اللہ پاک نے اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا حکم دیا، اور رسول کی اطاعت کو اپنی ہی اطاعت قرار دیا، اس لئے اللہ اور رسول کی اطاعت میں فرق

کرنا اور ایک کو حجت ماننا اور ایک کو حجت نہ ماننا خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔

دوسرے یہ کہ قرآن پاک کی تبیین اور تفہیم کی ذمہ داری آپ پر ہے، اس کی تشریح اور توضیح آپ کے ذمہ ہے، احادیثِ مبارکہ دراصل قرآن مجید کی تفسیر و توضیح ہیں، قرآن سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں، اس لئے دونوں میں باعتبار حجیت اور اطاعت فرق نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ اگر فرمان رسول کو الگ قرار بھی دیں تب بھی ان آیات سے اس کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔

غرض جب اللہ پاک نے آپ کی اطاعت کا حکم دیا، اور آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا، اور قرآن مجید کی وضاحت اور تشریح اور سمجھانے کی ذمہ داری آپ کو سونپی ہے تو آپ کی بات کیسے ناقابلِ قبول ہوگی، کیسے آپ کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اور کیسے آپ کی اطاعت سے انحراف کیا جائے گا؟ اللہ پاک تو آپ کی اطاعت کا حکم دے رہے ہیں اور آپ کی اطاعت کو معتبر قرار دے رہے ہیں اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ احادیث واجب الاتباع نہیں ہیں، غیر قابل قبول اور ناقابل اعتماد ہیں، دراصل یہ رسول اللہ کی بات کا انکار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور قرآن پاک کی اطاعت سے انحراف کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی بات کا انکار کرنا ہے۔

نبی کا حکم آیۃ من القرآن ہوتا ہے:

اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بات قرار دیا، اور اپنا حکم قرار دیا، جیسے حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز ادا فرماتے تھے۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم

قرآن مجید میں کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ قبلہ جو ہم نے آپ کے لئے بنایا تھا تو وہ لوگوں کی آزمائش کے لئے تھا:

"إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ"

کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے؟ اور کون اس سے انحراف کرتا ہے؟ کون ہمارے حکم کا بندہ ہے؟ اور کون اپنی مرضی کا بندہ ہے؟ کون قبلہ کو مقصود بناتا ہے اور کون ہمارے حکم کو مقصود بناتا ہے؟ اس قبلہ کا حکم قرآن پاک میں کہیں بھی نہیں، نبی علیہ السلام نے اس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ وہ حکم ہمارا تھا، ہم نے وہ حکم دیا تھا، پتہ چلا کہ احادیث رسول بھی وحی ہی ہوتی ہیں، وہ بھی حجت ہوتی ہیں، اسی وجہ سے علماء نے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم "آیۃ من القرآن" ہوتا ہے، کیونکہ نبی کا جو حکم ہوتا وہ دراصل وحی ہوتا ہے، جیسے قرآن وحی ہے ویسے ہی احادیث رسول بھی وحی ہیں، وہ سب من جانب اللہ ہوتی ہیں۔ ان کو بھی ماننا پڑتا ہے، بلکہ اگر ان کو نہ مانیں تو پھر قرآن کا غیر معتبر ہونا لازم آئے گا، اس لئے یہ کہنا کہ احادیث رسول حجت نہیں ہیں سراسر جہالت اور گمراہی ہے۔

گناہ کرنا عقل کے سالم نہ ہونے کی دلیل ہے:

دراصل یہ چیز عقل کی خرابی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے، اور آدمی کے پاس عقل سلیم اور عقل صحیح نہ ہونے کی علامت ہوتی ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عقلِ سلیم، اور عقلِ کامل کی علامت یہ لکھی ہے کہ عقلِ سلیم وہ ہوتی ہے جس سے معصیت یا گناہ کا صدور نہ ہو، یہ اُس عقل کے سالم ہونے کی دلیل ہے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ یہ فرقے تو لوگوں کو گناہوں میں مبتلا کر رہے ہیں بلکہ بعض تو کافر اور مرتد بنا رہے ہیں، ان کے پاس کہاں عقل سلیم ہوگی، یہ لوگ

تو اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں، ان کی عقلمندی حسی اور مادّی اعتبار سے تو ہو سکتی ہے کہ کڑوا، میٹھا، صفائی اور گندگی کو تو محسوس کرتی ہے لیکن ان کی عقل احکامِ شریعت کی کنہ کو، اس کے لِم کو، اُس کے رازوں کو اور اس کی حکمتوں کو نہیں پہچان سکتی۔ صفائی کی حقیقت تو ہم جانتے ہیں لیکن پاکی کی حقیقت نہیں جانتے۔

احادیثِ مبارکہ کے ظنی ہونے کا شبہ ؟

ان کی جانب سے ایک شبہ اور ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ تقریباً ساری احادیث مبارکہ ظنی ہیں، اور تم لوگ بھی اس کو ظنی کہتے ہو، اور ظن کے معنی گمان کے آتے ہیں اور قرآن پاک میں ہے:

"وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا" (یونس: ۳۶)

"اور ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں (اور) یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں"

قرآن مجید چونکہ قطعی اور یقینی ہے، اور احادیث مبارکہ ظنی ہیں، اور ظن کے بارے میں اللہ پاک نے فرمایا کہ وہ حق کے مقابلہ میں کسی کام کا نہیں، اس لئے احادیث مبارکہ کا ظنی ہونے کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں، وہ ناقابلِ اعتماد اور ناقابلِ عمل ہے۔

ظن کے معانی:

علماء تو علماء ہوتے ہیں، علماء نے ان کا جواب دیا کہ "ظن" کے کئی معنٰی آتے ہیں، ایک ظن تو اندازہ، گمان اور خیال کے معنی میں آتا ہے۔ اور ایک ظن یقین کے معنی میں آتا ہے، اور اس لفظ کے یہ دونوں معنٰی قرآن پاک میں ہیں، جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان یتبعون الا ظن" جن معبودوں کو یہ لوگ پوجتے ہیں اور ان کے بارے میں جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ صرف ان کا اندازہ (Guess) ہے، ان کا گمان ہے، ان کا خیال

ہے، ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، یہاں ظن اس معنیٰ میں ہے، ایک جگہ فرمایا: ''وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔ اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ''(البقرۃ:۴۵و۴۶)

''وہ (خاشعین وہ) لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس (بات) کا (بھی خیال رکھتے ہیں) کہ وہ بیشک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں''

اگر ''ظن'' اس آیت میں صرف ''گمان یا شک'' کے معنی میں لیا جائے تو پھر وہ آدمی کافر ہو جائے گا، کیونکہ اگر کسی نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کا یقین نہیں بلکہ گمان ہے تو اس طرح کہنے سے ایمان ہی نہیں رہے گا، اس لئے یہاں ظن کا مطلب یقین ہے، یعنی ''یَظُنُّوْنَ'' ''یوقنون'' یعنی ''یقین کرنے'' کے معنیٰ میں ہے۔

احادیثِ مبارکہ کے ظنی ہونے کا مطلب؟

اس کے علاوہ ایک ظن ظنِ غالب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اور احادیثِ مبارکہ کو ظنی اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے، ویسے تو ساری احادیثِ مبارکہ ظنی نہیں ہیں، بلکہ اخبارِ آحاد کو ظنی کہا جاتا ہے، اور زیادہ تر اسی قسم کی احادیث ہیں، اور جو احادیثِ مبارکہ متواتر ہوتی ہیں وہ تو قطعی ہوتی ہیں، اس میں کسی قسم کا شبہ اور تردد نہیں ہوتا، جن احادیث کو ظنی کہا جاتا ہے تو وہ بھی گمان اور خیال کے معنیٰ میں نہیں بلکہ ظن غالب کے معنیٰ کے اعتبار سے انہیں ظنی کہا جاتا ہے، اور ظنِ غالب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں منفی پہلو کو معدوم سمجھا جاتا ہے اور مثبت کو ترجیح دی جاتی ہے، احادیث مبارکہ کو جو ظنی کہا جاتا ہے تو وہ اسی معنیٰ کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ احادیث مبارکہ صرف موہوم اور خیالی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ اس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے صحیح ہونے کا ظن غالب ہے اور نا قابل اعتماد اور نا قابل قبول ہونے کا جو پہلو ہے وہ کالعدم بلکہ موہومی ہے۔

علماء پر اعتماد اور ان کی رہنمائی ضروری ہے:

اس قسم کے ان کے بہت سے خدشے، اعتراضات، اور لوگوں کو بھٹکانے کی کافی کوششیں ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں، علماء ان کے جوابات دیتے رہتے ہیں اور ان کے بارے میں کتابیں اور رسائل لکھتے رہتے ہیں، اور یہ علماء کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ حق کو دلائل کے ساتھ ثابت کرتے رہیں، اور ایسا قیامت تک ہوگا۔ قیامت تک گمراہ لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور اُن کے اعتراضات، شکوک و شبہات، غلط تاویلات اور تحریفات بھی ہوتی رہیں گی، لیکن علماء ان کا جواب دیتے رہیں گے، یہ حضور ﷺ کی پیشن گوئیوں میں سے ہے: ''لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي مَنْصُورِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ'' (سنن ترمذی: کتاب الفتن، ۲۳۵۱)

میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی، جس کی من جانب اللہ مدد کی جاتی رہے گی، ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا جو ان کی مخالفت کرے گا یا ان کو رسوا کرنا چاہے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

ایسا نہیں ہوگا کہ صرف غلط بات ہی بتانے والے رہ جائیں اور صحیح بات بتانے والے نہ ہوں۔ اس لئے علمائے حق کے ساتھ مستقل رابطہ رکھنا چاہیے، اُن پر اعتماد کرنا چاہیے اور ان کی تحقیقات کو قبول کرنا چاہیے اور ان سے پوچھ کر عمل کرتے رہنا چاہیے۔

پرویزی فتنہ کا تعارف:

ان گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ پرویزی فرقہ ہے، اس کا موجد غلام احمد پرویز ہے، ۱۹۰۳ء گرداس پور میں اس کی پیدائش ہوئی، اور سوءِ اتفاق کہ اس کا نام ایک اور کافر

غلام احمد قادیانی کے مشابہ ہے، ان دونوں نے امت میں ایک بہت بڑا فتنہ پیدا کیا، قرآن و حدیث میں من گھڑت تاویلات کیں، بلکہ ان میں تحریفات کیں، اور اسلام کے نام پر اپنے شرکیہ اور کفریہ مذہب کو فروغ دیا۔

اس فرقہ کے رد میں علماء نے کتابیں لکھی ہیں، اور ایک ایک عقیدہ پر مفصل کلام کیا ہے اور ان کا رد کیا ہے، اور امت کو ان کے جال میں پھنسنے سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

غلام احمد پرویز کے نظریات:

اس کے بھی چند نظریات ذہن میں رکھیں۔

(۱) اس کا کہنا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکزی حکومت ہے، جہاں سے احکامِ قرآن نافذ ہوں۔

(۲) حضور ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ”آپ کی پوزیشن صرف اتنی ہے کہ آپ اللہ کا قانون انسانوں تک پہنچانے والے ہیں، آپ کو قطعاً یہ حق نہیں ہے کہ کسی پر اپنا حکم چلائیں۔

(۳) آپ کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔

(۴) آخرت سے مستقبل کو مراد لیتے ہیں۔

(۵) جنت اور جہنم کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنت اور جہنم مقامات نہیں بلکہ انسانی ذات کی کیفیات ہیں۔

(۶) ملائکہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں۔

(۷) حضرت جبرئیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ انکشافِ حقیقت کی روشنی (ذریعہ یا واسطہ) کو جبرئیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۸) حضرت آدم، ان کی نبوت اور ان کے جنت والے قصہ کا انکار کرتے ہیں۔

(۹) تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔ اور اس کو جزءِ ایمان سے خارج قرار دیتے ہیں۔

(۱۰) انسان کے وجود کے بارے میں کہتے ہیں کہ ”سائنس کے انکشافات کی رو سے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی منازل طے کر کے قرنہا قرن کے بعد انسانی صورت میں متشکل ہو گئے ہیں، یعنی سب سے پہلے کوئی ایک فرد صورت انسانی میں جلوہ گر نہیں ہوا بلکہ ایک نوع وجود پذیر ہوئی۔

(۱۱) واقعۂ معراج کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۲) اس کے علاوہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج، قربانی، صدقہ الفطر کے بارے میں من گھڑت تاویلات کرتے ہیں، جو قرآن وحدیث کے سراسر خلاف ہیں، بلکہ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا افادیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ عقل و بصیرت سے کچھ واسطہ ہے، اور یہ چیزیں اسلامی زندگی سے ہٹ کر ہیں۔

(۱۳) احادیثِ مبارکہ کا انکار کرتے ہیں۔

اور صحیح بخاری کی چند احادیث کو ذکر کر کے کہتے ہیں کہ :”یہ نمونہ ہے ان احادیث کا جو بخاری شریف میں درج ہیں، اس میں اس قسم کی اور بہت سی احادیث ہیں، ان احادیث میں سے اگر کسی ایک کا بھی انکار کیا جائے تو ان حضرات کے نزدیک آپ کافر ہو جاتے ہیں، اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ اس قسم کی احادیث اس قابل ہیں کہ ان کے متعلق یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ فی الواقع رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں“ (مستفاد از غلام احمد پرویز شخصیت اور کردار: ۴۴ تا ۶۵)

یہ غلام احمد پرویز کے چند نظریات ہیں، جس سے آپ جان گئے ہوں گے کہ ان جاہلوں نے امت میں کتنا بڑا فتنہ پھیلایا، اور امت کو کافر اور مرتد بنانے کی کتنی کوششیں کیں؟

فرقۂ صدیق دیندار:

ان گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ صدیق دینداروں کا فرقہ ہے، ان کی ایک خانقاہ ہے، جو شہر حیدرآباد کے محلہ آصف نگر میں واقع ہے۔ اس کے بارے میں مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء نے کتابیں لکھیں ہیں اور ان کے عقائد کو انہیں کی کتابوں سے ذکر کرکے اس کا رد کیا ہے۔

صدیق دیندار کا تعارف:

اس فرقہ کے بانی کا نام سید صدیق حسین اور لقب دین دار ہے، اس کی پیدائش بروزِ پیر ۴ رمضان ۱۳۰۳ھ مطابق ۷ جون ۱۸۸۶ء گلبرگہ میں ہوئی۔ اور ۷ رجب المرجب ۱۳۷۱ھ مطابق ۴/ اپریل ۱۹۵۲ موت ہوئی۔

موصوف نے بشیر الدین محمود سے بیعت کی، محمد علی لاہوری سے قادیانی تفسیر پڑھی، اور غلام احمد قادیانی سے تعلق رکھا، یہ لوگ اگرچہ اپنے آپ کو غلام احمد قادیانی سے بظاہر لاتعلق دکھاتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، بلکہ فرقہ صدیق دیندار فرقۂ قادیانی ہی کی ایک شاخ ہے۔

صدیق دیندار کے نظریات:

ایک نظر ان کی نظریات کو بھی دیکھ لیتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں کیسے کیسے دعوے کئے؟ اور کیا کیا باتیں لکھیں؟ کہتے ہیں کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی صورت، نام اور لباس میں ظاہر ہوں گے۔ اور لوگ اس کو دیکھ کر اَنتَ رَبُّنَا کہیں گے۔

(۲) وہ اپنے دیدار کو سب سے بڑی نعمت اور خدا کا دیدار قرار دیتا ہے۔

(۳)دبے لفظوں میں نزولِ قرآن کا مظہر اپنے آپ کو قرار دیتا ہے۔

(۴)اپنے آپ کو قیامت کا مالک اور شافع قرار دیتا ہے۔

(۵)اپنے وجود کو انبیاء کی معراج قرار دیتا ہے۔

(۶)خود قادیانیت سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے مسیح موعود ہونے کا اقرار کرتا تھا۔

(۷)غلام احمد قادیانی کی پیشین گوئیوں کو اپنے اوپر منطبق کرتا تھا۔اور اس کی تصدیق کرتا تھا۔

(۸)اپنے بارے میں یوسف موعود ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔

(۹)یہ لوگ عام مومنین کو نبیوں کے برابر یا ان سے اونچا قرار دیتے ہیں۔

ایک مصرعہ میں کہتے ہیں: ''نہیں کوئی مسلم ہے نبیوں سے کچھ کم''

(۱۰)اپنے اولیاء کو تمام انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔

کہتے ہیں:''ہے فائق ہمارا ولی ہر نبی پر''

(۱۱)نبوت کے درجات ختم ہونے کے بعد مومنین کے کمال کی ابتداء مانتے ہیں۔

(۱۲)انبیاء کرام کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اس کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے ہیں۔

(۱۳)دو سو سے زیادہ لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ نبیوں کے منازل طے کئے ہیں۔(ماخوذ از احسن الفتاویٰ:۲۱۶ تا ۲۶۰)

آغاخانی فرقہ کا تعارف:

ان گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ آغاخانی اور ایک فرقہ بوہروں کا ہے، یہ دونوں فرقے شیعہ کے اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور شیعہ فرقہ کا بانی عبد اللہ ابن سبا یہودی تھا، اس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں اس کی بنیاد ڈالی، اولا

شام عراق اور مصر میں اپنے حامی بنائے، اور اس کے لئے اہل بیت سے خلوص و محبت کا جال بچھایا، اور لوگوں کو اس پر جمے رہنے کی تلقین کرنے لگا، لوگوں نے اس کے حربہ کو خوب سراہا، جب لوگوں کا اس پر اعتماد بڑھا تو اس نے دوسرا حربہ استعمال کیا، اور حضرت علی کو آپ ﷺ کے بعد سب سے افضل قرار دیا، اور حضرت علی کے فضائل لوگوں کے سامنے بیان کئے، جب لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات جڑ پکڑنے لگی تو حضرت عثمان غنیؓ کی شکایات کرکے ان کے خلاف بغاوت پھیلانے لگا، اور کہنے لگا کہ حضرت عثمان کی خلافت برحق نہیں بلکہ غاصبانہ قبضہ ہے، اصل حق دار تو حضرت علی ہیں، کیونکہ حضرت علی آپ علیہ السلام کے چچازاد بھائی، آپ کے داماد اور آپ پر پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہیں، اہل بیت میں سے ہیں، اور اس کو تقویت دینے کے لئے حضرت علی کے فضائل اور ان کے بارے میں احادیث گھڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کیں، جس کے نتیجے میں لوگ حضرت عثمان سے بدظن ہوگئے، اور ۴۰ دن ان باغیوں نے حضرت عثمان کا محاصرہ کرکے ان کو شہید کردیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ جب تختۂ خلافت پر فائز ہوئے تو اس نے لوگوں میں رازدارانہ طور پر یہ بات چلانی شروع کی کہ علی وصیِ رسول اللہ ہیں، کبھی کہتا کہ علی خلیفۂ بلافصل ہیں، رسول اللہ نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا تھا، ان کی وصیت کی تھی، ان لوگوں نے اس وصیت کو ضائع کردیا، حضرت علی کے حق کو چھین لیا، اور غاصبانہ اس پر قبضہ کرلیا، ان باتوں کو لے کر آپس میں جھگڑوں کا آغاز ہوگیا، مناظرے شروع ہوگئے، ایک دوسرے پر طعن و تشنیع شروع ہوگئی، جب اس نے یہ صورتِ حال دیکھی تو لوگوں کو اور بھڑکانے کے لئے اپنے سازش کا ایک اور جال پھینکا، اور حضرت علی کی کرامات اور وجدیہ کلمات وغیرہ کے ذریعہ ان کی الوہیت کا دعوی کیا، جب حضرت علی کے سامنے یہ باتیں پہونچی تو اولا انہوں نے خوب ڈانٹا، شرعی

سزاؤں کے نفاذ سے ڈرایا، اور کہا کہ اگر تم نے توبہ نہ کی تو تم لوگوں کو آگ میں جلادوں گا، لیکن جب اس نے اس حد تک گمراہی پھیلادی اور توبہ نہ کی اور ان سے باز نہ آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو جلاوطن کر دیا، لیکن وہ وہاں بھی باز نہ آیا اور اپنی گمراہی کو پھیلاتا رہا۔ اِدھر حضرت علی اس کو جلا وطن کرنے کے بعد بارِ خلافت اور اس کی مصروفیات میں مشغول تھے، اُدھر وہ اپنی گمراہ سرگرمی میں لگا ہوا تھا، جس کے نتیجے میں لوگوں کے حضرت علی کے بارے میں نظریات بدل گئے، عقیدے بدل گئے، اور وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ ابتداء وہ تین فرقوں میں بٹے تھے، تفضیلی، تبرائی، غالی۔ بعد میں شاخ در شاخ ہوتے ہوئے ان کے کئی فرقے بن گئے۔

شیعوں کے بارہ امام:

حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کی اولاد میں یہ اختلاف پیدا کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، اور اولادوں کے جانشین بنانے کے بارے میں بھی اختلاف ہوتا گیا، اور مختلف فرقے بنتے گئے، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفۂ اثنا عشریہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کو بیان کیا ہے۔

مشہور جو بارہ امام ان کے ہاں پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔(۱) سب سے پہلے امام ان کے نزدیک حضرت علی ہیں۔(۲) ان کے بعد حضرت حسن ہیں۔(۳) ان کے بعد حضرت حسین ہیں۔(۴) ان کے بعد حضرت زین العابدین ہیں۔(۵) ان کے بعد حضرت باقر ہیں۔(۶) ان کے بعد حضرت جعفر صادق ہیں۔(۷) ان لوگوں کے بقول حضرت امام جعفر صادق نے اپنی زندگی میں ہی اپنے سب سے بڑے صاحبزادے اسماعیل کو اپنا نائب بنایا مگر کچھ عرصہ بعد اسماعیل کا حضرت جعفر صادق کی زندگی میں انتقال ہوگیا۔ (۸) اسماعیل کے انتقال کے بعد حضرت جعفر نے اپنے دوسرے

صاحبزادے حضرت موسیٰ کاظم کو اپنا جانشین بنایا تھا اس لئے وہ آٹھویں امام کہلاتے ہیں (۹) نویں امام رضا علی ہیں۔ (۱۰) دسویں امام محمد تقی ہیں۔ (۱۱) گیارھویں امام علی نقی ہیں۔ (۱۲) بارھویں امام مہدی غائب ہیں جو قربِ قیامت ظاہر ہوں گے۔

جب حضرت جعفر صادق کا انتقال سنہ ۱۴۸ ہجری میں ہوا تو بعض شیعہ نے موسیٰ کاظم کو امام بنالیا، ان کے ماننے والے موسویہ کہلائے، اور انہوں نے حضرت موسیٰ کاظم کے بعد ان کی اولاد میں امامت کا سلسلہ جاری رکھا، اور بارہویں امام کے غار میں چھپ جانے کا عقیدہ گھڑ کے سلسلۂ امامت کو ان پر ختم کر دیا۔ لیکن کچھ نے حضرت جعفر صادق کے بیٹے اسماعیل ہی کو اپنا امام مانا، ان کے ماننے والوں کو اسماعیلی کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے امامت کے سلسلے کو ہمیشہ کے لئے جاری کر لیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں خدا کے حلول والا عقیدہ اور اس کے علاوہ بہت سے بیہودہ عقائد گھڑ لئے۔ ان کے اماموں کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ موجودہ دور میں ان کا پچاسواں امام پرنس کریم آغا خان ظاہر ہوا۔

آغا خانی لقب کیسے ملا؟

آغا خانی کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اسماعیلیوں کا ۴۵واں امام خلیل اللہ سنہ ۱۲۳۳ھ میں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا تو اسماعیلیوں کو خوش کرنے کیلئے خلیل اللہ کے دو سالہ لڑکے جس کا نام حسن علی تھا اس کو آقا خان کا لقب دیا گیا جس پر انہیں آقا خان محلاتی پکارا جانے لگا، اور ایرانی بادشاہ نے اپنی لڑکی سے بعد میں اس کی شادی بھی کر دی مگر بادشاہ فتح علی کی وفات کے بعد حسن علی شاہ آقا خانی محلاتی کو ایران میں بڑی مشکلات پیش آئیں اس لئے انہوں نے ایران کو چھوڑ کر ہندوستان میں بمبئی آکر سکونت اختیار کر لی پھر یہاں آکر آقا خان سے آغا خان کہے جانے لگے۔ اور اس فرقہ کے اماموں کے

ساتھ آغاخانی لقب شروع ہوا، اور آغاخان اول، دوم، سوم، چہارم امام بن کر آئے۔

(آغاخانیت علماءِ امت کی نظر میں: ۱۱)

آغاخانیوں کے نظریات:

آغاخانی اسماعیلی فرقہ شیعیت میں غالی فرقہ ہے، ذیل میں اس زندیق فرقہ کے عقائد انہی کی کتابوں سے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) ان کا کلمہ یہ ہے: ''اشھد ان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ و اشھد ان امیر المؤمنین علی ولی اللہ'' ہے۔

(۲) اللہ تعالی کی عبادت کے بجائے امام کی عبادت کرتے ہیں۔

(۳) حضور ﷺ کو حضرت علی کی بیوی بتاتے ہیں۔

(۴) ان کا سلام یا علی مدد اور سلام کا جواب بھی یا علی مدد ہے۔

(۵) ساتویں امام محمد بن اسماعیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے شریعت محمدیہ کے ظاہر کو باطل کر کے باطنی شریعت جاری کی۔

(۶) اللہ تعالی کے امام حاضر کے روپ میں تشریف لانے کے قائل ہیں۔

(۷) امام حاضر کو عالم الغیب والشہادۃ کہتے ہیں۔

(۸) انبیاء کرام کو معصوم نہیں مانتے۔ اور امامت کو نبوت سے بالاتر مانتے ہیں۔

(۹) قرآن مجید کو اللہ تعالی کی کتاب قرار نہیں دیتے، بلکہ حضرت عثمان کی کتاب کہتے ہیں۔ اور اپنے حاضر امام کو بولتا قرآن کہتے ہیں اور وہ جو بھی احکام بتلائے اس پر عمل کرتے ہیں، اور اس کے کلام کو اللہ کے کلام کے برابر قرار دیتے ہیں۔

(۱۰) قرآن مقدس کو عرب آبادی کے لئے مانتے ہیں۔

(۱۱) حضرت علی کو پوری کائنات کے خالق مانتے ہیں۔

(۱۲)امام حاضر میں اللہ تعالی کے نور کے حلول کے قائل ہیں۔

(۱۴)ھوالحی القیوم کی عملی تصویر امام حاضر کو قرار دیتے ہیں۔

(۱۵)یہ لوگ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں۔

(۱۶)پانچ وقت نماز کے مقابلہ میں تین وقت کی دعا کافی سمجھتے ہیں۔

(۱۷)وضو کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور دل سے وضو کے قائل ہیں۔

(۱۹)بیت اللہ کی طرف رخ کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ جدھر چاہے رخ کر کے نماز پڑھنے کے قائل ہیں۔

(۲۰)روزہ کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل روزہ تو آنکھ کان اور ناک کا ہوتا ہے، اور کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔(مختصر از ادیان باطلہ صفحہ: ۸۱)

بوہریہ فرقہ کا تعارف:

اس فرقہ کی طرح ایک فرقہ بوہروں کا پایا جاتا ہے، بوہرہ کے معنٰی تاجر کے آتے ہیں، اور یہ لوگ عموماً تجارت کرتے ہیں اس لئے ان کو بوہری کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ بھی فرقۂ اسماعیلیہ کی ہی ایک شاخ ہے۔ اس کے بانی برہان الدین کی ۲۰ ربیع الاول، ۱۳۳۳ھ ۶ مارچ ۱۹۱۵ء میں سورت میں پیدائش ہوئی، والد کا نام طاہر سیف الدین تھا، اپنے بیٹے کی پیداءئش سے ۴۰ دن پہلے وہ اکیاونویں داعی بنائے گئے، اور انہوں نے اپنے بیٹے برہان الدین کو ۵۲ باونواں داعی قرار دیا۔

اس فرقہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب مستنصر باللہ ۴۲۷ھ بمطابق ۱۰۳۵ء (وفات ۴۸۷ھ بمطابق ۱۰۹۴ء) کا انتقال ہوا تو فاطمیوں میں ان کے جانشین بنانے میں اختلاف ہوا، بعض نے المستنصر کے صاحبزادے نزار کو جانشین بنایا اور بعض نے المستنصر کے

چھوٹے صاحبزادے المستعلی کو جانشین بنایا، جنھوں نے نزار کو جانشین بنایا وہ نزاریہ کہلائے اور جنہوں نے المستعلی کو جانشین بنایا وہ مستعلویہ کہلائے۔ مستعلی کا معنی وہ غیبوبت سے کرتے ہیں کہ ان کے آخری امام طیب تھے جس نے کم سنی میں ہی غیبوبت (۵۲۴ھ بمطابق ۱۱۱۳ء میں) اختیار کرلی تھی۔ اس وقت سے ان میں امام مستور کا دور شروع ہوا ہے مگر دعوت کا سلسلہ داعیوں کے ذریعے اب بھی جاری ہے۔ اس فرقہ کے پیروکار یمن، مصر، ہندوستان اور پاکستان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، ہندوستان میں ان کا مرکز ۹۴۶ھ بمطابق ۱۵۴۰ء میں یمن سے احمد آباد گجرات میں منتقل ہوا، اور وہاں پر ان کے منصب کا داعی یوسف بن سلیمان تھا۔ جب ان کے چھبیسویں داعی داؤد بن عجب شاہ کا انتقال ۱۵۹۱ء میں ہوا تو پھر اکثریت نے داؤد بن قطب شاہ کو ستائیسواں داعی مانا اور یمن والوں نے سلیمان بن حسن کو ستائیسواں داعی بنالیا، اس بناء پر داؤد کو داعی ماننے والے داؤدی کہلائے، اور سلیمان کو داعی ماننے والے سلیمانی کہلائے۔ ہندو پاک میں اب ان کے داعی برہان الدین تھے، جو کہ ان کے ۵۲ ویں داعی کہلاتے ہیں۔

بوہروں کے نظریات:

چونکہ یہ بھی شیعہ ہی ہیں اور اسماعیلی مستعلوی فرقہ سے ان کا تعلق ہے اس لئے ان کے نظریات بھی انہیں سے ملتے جلتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اپنے اماموں میں اللہ کے حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اللہ کی ذات کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی صفت سے متصف نہیں کیا جاسکتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات درحقیقت ائمہ کی صفات ہیں' اللہ تعالیٰ کے لئے کسی صفت کا اقرار کرنا شرک ہے۔

(۲) نیز حق تعالیٰ کے بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ہمارے اعتقاد کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے تمام نعوت اور اوصاف مثلاً خالق، عالم، قادر وغیرہ مجازی ہیں، حقیقت میں وہ عقلِ اول پر صادق آتے ہیں جو عالم روحانی کا پہلا موجد ہے' عالم جسمانی میں ان اوصاف ونعوت سے امام الزمان موصوف ہوتے ہیں' کیونکہ وہ اس عالم میں عقل اول کے مقابل ہیں، یہاں تک کہ لفظ "اللہ" کا لفظ بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا عقل اول اور امام پر اطلاق کیا جاتا ہے۔

(۳) ان کے ائمہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں: میں ہی اول اور آخر ہوں' میں ہی ظاہر اور باطن ہوں' میں ہر چیز کے متعلق جانتا ہوں اور میں ہی حفیظ اور علیم ہوں' آسمان میں نے بنائے ہیں اور زمین کو میں نے ہموار کیا ہے' ہم اللہ کے آل ہیں اور ہم نے ہی سچے نبی کو بھیجا ہے، جو کچھ اللہ کے بارے میں کہا گیا وہ ہمارے بارے میں بھی ہے اور جو ہمارے متعلق کہا گیا وہ ہماری جماعت کے متعلق بھی ہے۔

(۴) قرآن مجید کے بارے میں کہتے ہیں کہ نبی کے دل میں جو بات بہتر معلوم ہوتی ہے نبی وہ بات لوگوں کے بتاتے ہیں اور اسی کو کلام الٰہی کہتے ہیں۔ تاکہ لوگ اس کو مان لیں۔

(۵) ان کا کلمہ: "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ مولانا علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" ہے۔

(۶) ان کی اذان میں چند الفاظ کا اضافہ ہے، وہ الفاظ یہ ہیں: "أشهد أن محمدا رسول اللہ" کے بعد "أشهد أن مولانا عليا ولی اللہ" اور "حی علی الفلاح" کے بعد "حی علی خیر العمل محمد وعلی خیر البشر وعشرتها علی خیر العمل"۔

(۷) تین ہی نمازوں کے قائل ہیں۔

(۸) نمازِ جمعہ کا انکار کرتے ہیں۔

(۹) انبیاء کو غیر معصوم قرار دیتے بلکہ اپنے ائمہ کا درجہ انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔

انبیاء کے بارے میں کہتے ہیں کہ "تمام انبیاء کی حد تنزیل ہے، ان کی شریعتوں میں اختلاف اور شبہ پایا جاتا ہے، ان سے گناہ صادر ہوئے' کیونکہ انہوں نے ایسے مراتب طلب کئے جن کے وہ مستحق نہ تھے، وہ سب غیر معصوم تھے، ان میں آنحضرت بھی شامل ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ خود آپ کو خطاب کرکے فرماتا ہے: انا فتحنا لک فتحاً مبیناً لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تأخر، بخلاف اس کے آپ کے وصی مولانا علی اور آپ کی نسل میں جتنے ائمہ ہوئے ان کی حد تاویل ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا' جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ماتریٰ فی خلق الرحمن من تفاوت، انہوں نے ایسے مراتب طلب نہیں کئے جن کے وہ مستحق نہ تھے' یہ سب ملائکہ بالفضل اور معصوم ہیں اور چار درجے انبیاء مرسلین سے افضل ہیں۔

(۱۰) ان کے ایک امام محمد بن اسماعیل کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ساتویں امام ہونے کے علاوہ ساتویں وصی' ساتویں ناطق اور ساتویں رسول بھی ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کے قیام سے "عالم الطبائع" کو ختم کیا اور (حضرت محمد ﷺ) کی شریعت کو معطل کیا۔

(۱۱) امام طیب کی نسل میں امامت کا سلسلہ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ امام طیب غائب ہیں، مگر وہ داعیوں کو ہدایت دیتے رہتے ہیں۔

(۱۲) نیز اپنے ائمہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا درجہ رسول اللہ کے برابر اور دوسرے نبیوں سے بالاتر ہے۔

(۱۳) اپنے اماموں کے لئے حلت و حرمت کا اختیار مانتے ہیں۔

(۱۴) شریعت میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار مانتے ہیں۔

(۱۵) خدا کے اوصاف سے متصف مانتے ہیں۔

(۱۶) ان پر وحی کا نزول مانتے ہیں۔

(۱۷) ان کو معصوم اور گناہ کے قصد و ارادہ سے پاک قرار دیتے ہیں۔

(۱۸)ہر زمانے میں ایک امام کے وجود کے ضروری ہونے کے قائل ہیں، اور اسی کے وجود کی برکت سے زمین کی برقراری سمجھتے ہیں۔

(۱۹)اپنے امام کو مذہبی اور سیاسی دونوں حکومتوں کا مالک سمجھتے ہیں، اور زمین کے ہر حصے پر اس کا اختیار مانتے ہیں، اور اس کے فیصلے کو آخری فیصلہ قرار دیتے ہیں۔

(۲۰)سود کو جائز قرار دیتے ہیں۔

(۲۱)دیوالی جو کہ ہندوؤں کی عید ہے اس پر خوشی مناتے ہیں۔

(۲۲)ہندی مہینوں کے اعتبار سے حساب کتاب کو ضروری سمجھتے ہیں۔

(۲۳) ان کی مسجد، جماعت خانہ اور قبرستان سب مسلمانوں سے الگ ہوتے ہیں۔

(ماخوذ:صراطِ مستقیم: ۷۹تا ۸۱۔ادیان باطلہ۔نجم الفتاویٰ۔فتوی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

مرتد فرقوں کا شرعی حکم:

یہ ہیں ان گمراہ فرقوں کے بیہودہ گستاخانہ، انبیاء کی توہین آمیز، کفریہ عقائد و نظریات، اب اندازہ لگائیے کہ ان کا دین اور اسلام سے کیا تعلق ہے؟ اس لئے تمام علماء کرام نے ان تمام فرقوں کو اور ان کے متبعین کو ان باطل عقائد کے سبب کافر اور زندیق قرار دیا ہے۔ اور ان لوگوں کے ساتھ مناکحت کو ناجائز قرار دیا ہے، اور ان کے ذبیحہ کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کی نماز جنازہ میں شرکت سے منع کیا ہے، اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے روکا ہے۔ اور ان کے ساتھ مسلمانوں جیسے معاملات اور میل جول کو نادرست قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی گمراہی سے ہم سب کی اور ساری امتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

❋ ❋ ❋

اسلام کی جامعیت:

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

”فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ”اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا“ (المائدہ:۱۰۳)

”آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو مایوسی ہوئی اور احکام و قواعد میں بھی) اور (اس کمال سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا (دینی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی اور اکمالِ دین میں دونوں آ گئے) اور میں نے اسلام کو تمہارا دین (ہمیشہ کیلئے) پسند کر لیا (یعنی قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا۔ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہ کیا جائے گا“

تکمیلِ دین کا مطلب:

محترم بزرگان دین!

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دین کی تکمیل کا اعلان فرمایا، جو ایک طرف امت محمدیہ کی خصوصیت اور اس کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے تو دوسری طرف اس میں ایک بہت ہی اہم پیغام امت محمدیہ کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

یہاں تکمیل دین سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب شریعت کے حدود و فرائض، حلال و حرام، امر و نہی، شریعت کے دلائل اور اصول، اور اجتہاد کے قوانین جن کی امور دین میں ضرورت ہوتی ہے ان سب کی تکمیل ہو گئی ہے، دشمنوں کو مغلوب کر دیا گیا، اور دین اسلام کو اللہ پاک نے اپنی مدد و نصرت کے ذریعہ تمام ادیان پر غالب کر دیا، اب دین میں نہ کوئی نسخ ہو گا، نہ کسی حکم میں کمی اور زیادتی ہو گی، اب نہ کسی اور دین کی ضرورت ہے، اور نہ کسی اور نبی کی ضرورت ہے۔

اسی بنیاد پر ابو علی جبائی اور علامہ بلخیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے نازل ہونے کے بعد کوئی آیت حلت اور حرمت کے سلسلہ میں نازل نہیں ہوئی۔ (روح المعانی: ۳۷۵/۴۔ تفسیرِ قرطبی: ۴۶/۶۔ تفسیر ابن کثیر: ۲۶/۳ و ۲۷)

لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہاں تکمیلِ دین سے دین کے ایک بڑے حصہ کا مکمل ہونا مراد ہے، کیونکہ اس کے بعد قرآن نازل ہوا، آیتِ ربا اس کے بعد نازل ہوئی، اور آیت کلالہ اس کے بعد نازل ہوئی، اور ظاہر ہے ان آیات میں دین کے اہم احکام بیان کئے گئے ہیں، اس لئے جس آیت میں اللہ پاک نے تکمیل دین کا ذکر کیا اس سے مراد یہ ہے کہ دین کا ایک بڑا حصہ اس دن مکمل ہو گیا۔ (تفسیرِ قرطبی: ۴۶/۶)

یہود کی ایک حسرت:

جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو کچھ یہودی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! آیَۃٌ فِیْ کِتَابِکُمْ تَقْرَؤُوْنَھَا لَوْ عَلَیْنَا اُنْزِلَتْ . . . لَاتَّخَذْنَا ذٰلِکَ الْیَوْمَ عِیْدًا"

اے امیر المومنین! تمہاری کتاب یعنی (قرآن مجید) میں ایک ایسی آیت ہے اگر وہ ہم پر نازل کی جاتی تو ہم لوگ اس دن کو عید کا دن بنا لیتے، انہوں نے کہا کہ کونسی آیت

کی تم بات کر رہے ہو؟ کہنے لگے کہ ”اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ “الخ، حضرت عمرؓ نے جواب دیا:

”اِنِّیْ لَاَعْلَمُ الْیَوْمَ الَّذِیْ اُنْزِلَتْ فِیْهِ وَالْمَکَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَتْ“

بیشک میں اس دن کو بھی جانتا ہوں، جس دن وہ آیت نازل ہوئی، اور اس مقام کو بھی جانتا ہوں جہاں وہ آیت اتری، وہ آیت نبی ﷺ پر جمعہ اور عرفہ کے دن میدان عرفات میں عصر کے بعد سنہ دس (۱۰) ھجری میں نازل ہوئی، اس کے بعد فرمایا:

”کِلَاهُمَا بِحَمْدِ اللّٰهِ لَنَا عِیْدٌ“ (تفسیر ابن کثیر: ۲۶/۳ و ۲۷)

اور الحمدللہ وہ دونوں دن ہمارے لئے عید کے دن ہیں۔

جس وقت آپ ﷺ پر وحی نازل کی جارہی تھی آپ عضباء نامی اونٹنی پر تھے، اونٹنی وحی کے بوجھ سے بوجھل ہوکر بیٹھ گئی، اس کے بعد آپ ﷺ دنیا میں اکیاسی (۸۱) دن رہے، اور اس کے بعد آپ ﷺ کی روحِ مبارکہ اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس پرواز کرگئی۔ (تفسیرِ قرطبی: ۶۴/۶ و تفسیر بغوی: ۱۳/۳)

کیا تکمیل دین کے اعلان سے قبل دین ناقص تھا؟

یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ اللہ پاک نے جب اس آیت مبارکہ میں تکمیل دین کا اعلان کیا ہے تو کیا اس سے پہلے دین مکمل نہیں تھا؟ کیا دین اس سے قبل ناقص تھا؟ مفسرین نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں، ان میں سے ایک جواب جس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ دین بلاشبہ ناقص نہیں تھا، بلکہ دین ابدی طور پر کامل و مکمل ہے، جس وقت جو بھی حکم اللہ پاک نازل فرماتے اس وقت کے اعتبار سے وہ حکم کافی اور کامل ہوتا، کبھی اس میں نقص نہ رہا، ہاں وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلی ہوتی رہی، اور حالات کے اعتبار سے مختلف احکامات نازل کئے جاتے رہے، کبھی کسی حکم کو منسوخ کردیا اور اس کی جگہ دوسرا حکم نازل فرمایا، لیکن اس طرح کی تبدیلی اللہ پاک کے

آئندہ کے حالات کو نہ جاننے یا ان احکامات کے مخلوق کے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ اللہ پاک کو پہلے ہی سے علم غیب تھا کہ کب کونسا حکم نازل کرنا ہے اور کب کونسا حکم منسوخ کرنا ہے، وقت اور لوگوں کے احوال کے اعتبار سے اللہ پاک احکامات نازل فرماتے رہے، لیکن چونکہ آئندہ اس میں تبدیلی کا یا نسخ کا یا زیادتی کا امکان ہوتا اس لئے تکمیل کا اعلان نہیں فرمایا، لیکن چونکہ بعثت کے آخر زمانے میں سارے احکامات کو نازل کر دیا گیا، اور قیامت تک کے لئے ابدی طور پر اس کو باقی رکھ دیا گیا، اور اس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی، نسخ یا کسی قسم کی کمی یا زیادتی کا امکان نہیں رہا تو فرمایا کہ آج یہ دین کامل و مکمل ہو گیا۔ اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تکمیل دین کے اعلان سے قبل دین ناقص نہیں تھا۔ حالات اور وقت کے اعتبار سے جو بھی حکم نازل ہوتا وہ کافی اور وافی ہوتا تھا، کسی حکم میں تبدیلی یا کسی حکم کو منسوخ کرنے یا کسی حکم کا اضافہ نہ تکمیل دین کے منافی ہے، نہ نقصِ دین کا باعث ہے۔ (تفسیرِ رازی: ۴۶۶/۵)

نظامِ زندگی اور اس کا مقصد:

غرض اللہ پاک نے اس آیت میں دین کی تکمیل کا اعلان کیا ہے، دنیا میں اور بھی مذاہب ہیں اور بھی ادیان ہیں لیکن ان سب میں کامل دینِ اسلام ہے، اللہ پاک نے اس دنیا میں زندگی گزارنے کا نظام دو طرح رکھا ہے، ایک نظام حق ہے اور ایک باطل، ایک اسلامی نظام ہے، اور ایک غیر اسلامی نظام ہے، اسلامی نظام مکمل اور جامع ہے، جو تمام افکار، عقائد، معاملات، معاشرت، اخلاق، خوشی، غم، محبت، نفرت، دوستی اور دشمنی سب کو حاوی ہے، اور اس کے ساتھ ایک باطل نظامِ زندگی ہے جو نہ جامع ہے اور نہ اس میں ان چیزوں کی تعلیم ہے، اور یہ دونوں نظام اللہ کی طرف سے تکوینی طور پر ہیں، اور یہ دونوں نظام اللہ پاک نے بندوں کے امتحان اور آزمائش کے لئے رکھے ہیں، اور

امتحان میں دونوں چیزیں سامنے ہوتی ہیں، تب ہی آدمی کا اصل امتحان ہوتا ہے، اب اس کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے اختیار سے کس نظام پر چلتا ہے؟ حق کے راستے پر چلتا ہے، یا باطل کے راستے پر، اگر باطل پر چلتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو جان بوجھ کر ضد اور ہٹ دھرمی کرتے ہوئے غلط راستے کو اختیار کرتا ہے جس کو یہودیت کہتے ہیں، یا اسے مس انڈراسٹینڈنگ (miss understanding) ہو جاتی ہے، گویا وہ غلط فہمی کی بنیاد پر غلط راستہ اپناتا ہے، جس کو نصرانیت کہتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں ایک حق راستہ ہے، اور وہ ہے دین اسلام، یہ راستے آپ کو قیامت تک ملیں گے، کبھی ہم اس کو ختم نہیں کر سکتے، ہاں جب بالکل قیامت قریب ہوگی اور اس کے واقع ہونے میں تھوڑا سا عرصہ باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرت سے ختم فرمائیں گے، اور حق کو پوری دنیا میں غالب کر دیں گے، سورۂ فاتحہ میں اللہ پاک نے ان تینوں نظاموں کو بیان کیا ہے، ایک مغضوب علیہم والا نظام ہے، اور ایک ضالین والا نظام ہے، اور ایک صراطِ مستقیم اور منعم علیہم والا نظام ہے، اس وقت مسلمان ان تین نظاموں کی کشمکش میں ہیں۔

اسلامی تہذیب خود ساختہ نہیں ہے:

ان سب میں اسلامی نظام سب سے سچا، سب سے سیدھا، اور سب سے جامع اور سب سے آسان نظام ہے، یہ مذہب اور شریعت خود ساختہ نہیں ہے، جیسے بعض درخت خود رو ہوتے ہیں، ایسے ہی کچھ تہذیبیں خود رو ہیں، کچھ بائی پلان (By plan) لوگوں نے ایجاد کی ہیں، وہ سب کی سب باطل ہیں، لیکن یہ تہذیب اور طریقہ خود رو اور انسانوں کی طرف سے بائی پلان (by plan) نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ مکمل اور جامع ہے، اور یہ تہذیب اور یہ طریقہ سرکار دوعالم ﷺ ہمارے پاس لے کر آئے ہیں، اور ساری چیزوں میں آپ ﷺ نے امت کی رہنمائی فرمائی ہے، زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی

حصہ آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس میں آپ ﷺ کی رہنمائی نہ ملے، اور یہ ساری شریعت اور ساری تہذیب وحی کے ذریعہ ہی اتاری گئی ہے، آپ ﷺ نے اپنی طرف سے کوئی راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ سب من جانب اللہ تھا، قرآن پاک میں ہے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى'' (النجم ۳تا۴)

''اور نہ آپ اپنی خواہشِ نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہوتا ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے''

اسلام کی خصوصیت:

اس تہذیب کی جو خصوصیت ہے وہ آپ کو کسی اور تہذیب میں نہیں ملے گی، اور وہ ہے اس کا کامل اور جامع ہونا۔ اس میں اتنی جامعیت ہے اور اتنی باریکیاں ہیں کہ آدمی تصور نہیں کر سکتا، بڑے سے بڑے حکم سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے حکم اور چھوٹے سے چھوٹے پہلو تک اس میں بیان کئے گئے ہیں، حتیٰ کہ بیت الخلاء جانے اور اس میں اپنی حاجت کو پورا کرنے تک کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

مشرکین کا اعتراض اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا جواب:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مشرکین نے کہا تھا: ''اِنِّیْ اَرٰی صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتّٰى يُعَلِّمَكُمُ الْخِرَاءَةَ'' (صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ: ۶۳۰) تمہارا نبی کیسا نبی ہے؟ تم کو وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا ہے، جیسے تم چھوٹے بچے ہو، بے وقوف ہو، گویا تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے، حتیٰ کہ وہ تمہیں استنجا کا بھی طریقہ بتاتا ہے؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب میں بطورِ فخر فرمایا: ''اَجَلْ'' ہاں! ہمارے نبی ہمیں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتلاتے ہیں، حتی کہ استنجا کرنے کا طریقہ تک ہمیں بتاتے ہیں، کیونکہ یہ ایک مکمل دین ہے، اس میں بڑی

بڑی باتوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی تعلیم دی گئی ہے، دیکھنے میں تو چھوٹی نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں چھوٹی نہیں ہوتیں۔

آپ امت کے لئے شفیق باپ کی طرح ہیں:

اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے لئے باپ کی طرح ہوں تمہیں ہر چیز سکھانی پڑتی ہے: ''اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ اُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ'' (سنن ابو داؤد: کتاب الطھارۃ:۸)

جیسے ایک باپ شفقت اور محبت کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بچہ کو سکھاتا ہے ایسے ہی میں بھی تمہیں سکھاتا ہوں، کیونکہ میں آیا ہی ہوں تم کو سکھانے کے لئے، تم ان اصول اور قواعد سے واقف نہیں ہو، اس دین اور اس تہذیب سے واقف نہیں ہو، اس لئے تمہیں سکھانے اور بتانے کی ضرورت ہے۔

آدابِ استنجا اور اس کے فوائد:

اب استنجا کا ہی مسئلہ لے لیجئے، کیونکہ ان لوگوں نے اس مسئلہ کو لے کر اعتراض کیا تھا کہ باضابطہ یہ بھی کوئی سیکھنے کی چیز ہے؟ اس لئے ذرا ہم اس کو یہاں کے ماحول میں جانچتے ہیں، یہاں آدمی نہانے کے لئے ٹب (Tub) میں بیٹھ جاتا ہے، اب آدمی پاک ہے یا ناپاک، نہیں معلوم، وہ پانی پاک ہے یا ناپاک، نہیں معلوم، اور پھر یہاں کے ماحول میں استنجاء کے بعد پانی بھی استعمال نہیں کیا جاتا، گویا نجس اور ناپاک حالت میں آدمی ٹب میں بیٹھ جاتا ہے، خود بھی ناپاک اور پانی بھی ناپاک، جب کہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ آدمی ناپاک ہو یا پانی ناپاک ہو تو اس طرح غسل نہ کیا جائے، اسلام یہ چاہتا ہے کہ خوب صفائی ہو، پانی صاف رکھا جائے اور پاک پانی استعمال کیا جائے، اور پاک برتن استعمال کیا جائے، اور اس پانی سے پاکی حاصل کی جائے، اگر پاک پانی میں یا برتن وغیرہ میں ایک قطرہ بھی نجاست کا گر جائے تو سارا پانی اور برتن ناپاک ہو جاتا ہے، جب تک آدمی اس کو

زائل نہیں کرتا اس وقت تک وہ پانی اور وہ برتن ناپاک ہی رہتا ہے، اور اس کا استعمال جائز نہیں ہوتا، لیکن یہاں اسی پانی سے کلی بھی کی جارہی ہے اور اسی پانی کو ناک میں بھی ڈالا جارہا ہے، اور منھ اور ناک کے ذریعہ وہی گندا پانی پیٹ میں بھی جا رہا ہے، جو نجاست اور ناپاکی پیٹ سے نکلتی ہے وہی ناپاکی اور نجاست پیٹ میں جارہی ہے۔ آدمی پاکی حاصل کرنے کے بجائے اور ناپاکی میں ملوث ہورہا ہے، ذرا ہماری اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب دیکھیں، اور ان کی تہذیب دیکھیں۔

استنجا سے قبل دعا کی اہمیت:

ایسے ہی استنجا کے بارے میں نبی ﷺ نے ایک دعا سکھائی کہ آدمی استنجا کے لئے جائے تو یہ دعا پڑھ لے: ''بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ'' (صحیح بخاری: کتاب الوضوء: ۱۴۲ والمعجم الاوسط: ۲۸۰۳)

اس دعا کی تعلیم کیوں دی گئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ استنجا خانہ جنات اور شیاطین کی جگہ ہوتی ہے، اور وہاں ان کی حاضری ہوتی ہے، اب اگر کوئی اس دعا کو پڑھ لیتا ہے تو اس کی برکت کی وجہ سے آدمی اور شیاطین وجنات کے درمیان پردہ حائل ہو جاتا ہے، وہ اب آدمی کو دیکھ نہیں پاتے، اور پھر ان کے مزاج میں شرارت اور خباثت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے وہ ستانے کی فکر میں بھی رہتے ہیں، جب آدمی دعا پڑھتا ہے تو ان کی شرارت اور خباثت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ (عون المعبود: ۱/ ۲۱)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی موت کا واقعہ:

جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بیت الخلاء گئے، کافی دیر ہوگئی، لوگوں نے کافی انتظار کے بعد دروازہ کھول کر دیکھا تو ان کو اس حال میں پایا کہ ان کی روح نکل چکی تھی، اس وقت غیب سے آواز آئی کہ ہم نے قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل

کر دیا۔ (العرف الشذی: ۱/ ۳۱) دعا کے پڑھنے سے ان سے حفاظت ہوتی ہے، اب یہ کس کو پتہ ہے کہ یہ دعا پردہ اور حفاظت کا کام کرتی ہے، جو اس دعا کو پڑھ کر جائے گا مرد ہو یا عورت وہ ان کی نظروں سے پوشیدہ ہو جائے گا، جنات اسے نہیں دیکھ سکیں گے، جب وہ دیکھ نہیں پائیں گے تو ان کی شرارت اور ان کی خباثت سے وہ محفوظ ہو جائے گا، اگر کوئی یہ دعا نہیں پڑھتا ہے تو پھر اسکے اور جنات کی نگاہوں کے سامنے کوئی پارٹیشن (partition) اور کوئی حجاب نہیں ہوتا، اور وہ آدمی کی اس حالت کو دیکھ کر استہزاء کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔ (اکمال المعلم: کتاب الطہارۃ: ۱۲۲) بلکہ دوسروں کو بلا کر دکھائیں تو بھی کچھ تعجب نہیں، لیکن یہ ہمارے لئے کتنی شرمندگی کی بات ہے کہ کوئی ہم کو حاجت سے فارغ ہوتے ہوئے دیکھے اور ہمارا مذاق اڑائے، کیا ہم اس کو برداشت کریں گے؟ اب ذرا اس پسِ منظر میں آپ ﷺ کی سکھائی جانے والی دعا کو دیکھیں کہ یہ کتنی عظیم اور اہم دعا ہے، دیکھنے میں بہت معمولی ہے لیکن اس کی اہمیت کا ہمیں اندازہ نہیں۔ ہمارے نبی ﷺ نے تو ہمیں یہ تہذیب سکھلائی، اور ہمیں یہ تعلیم دی، اب بتاؤ کہ تمہاری تہذیب نے کیا دیا؟

استنجا میں قبلہ کی جانب رخ یا پشت نہ کریں:

ایسے ہی آپ ﷺ نے بیت الخلاء کا ایک ادب یہ بتایا ہے کہ اس میں قبلہ کی طرف رخ یا پشت کر کے نہ بیٹھیں۔ حدیث میں ہے:

”نَهَانَا اَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ لِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ اَوْ بِعَظْمٍ“ (صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ: ۶۲۹)

آپ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا ہے کہ ہم پیشاب اور پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھیں، یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں، یا تین پتھروں سے کم سے استنجا کریں، یا لید یا ہڈی سے استنجا کریں۔

قبلہ کی طرف منھ کرکے بیٹھنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے، کیونکہ یہ احترام کے خلاف ہے، بیت اللہ قابل تعظیم ہے اس لئے احتراماً دوسری طرف اپنا منھ یا اپنی پشت کرنے کا حکم ہے، کیونکہ یہ نجاست والا عمل ہے، اور گندگی والا عمل ہے، اگر ہم بیت اللہ کی طرف رخ یا پشت کریں گے تو اس کی بے احترامی ہوگی، اس لئے اس حالت میں آپ ﷺ نے بیت اللہ کی طرف رخ یا پشت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کریں:

ایسے ہی آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ دایاں ہاتھ قابلِ احترام ہے، اور اللہ اور رسول کی نظر میں دائیں ہاتھ سے یا دائیں جانب سے کیا جانے والا کام پسندیدہ ہوتا ہے، اس لئے دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے سے منع فرمایا، اور پھر دائیں ہاتھ ہی سے آدمی غذا کھاتا ہے، اب ذرا آدمی غور کرے کہ جس ہاتھ سے کھانا کھایا جاتا ہے اسی ہاتھ سے گندگی صاف کی جائے، یہ کتنی تکدر اور نفرت والی بات ہے؟

استنجا میں ڈھیلے کا استعمال اور اس کے فوائد:

ایسے ہی آپ ﷺ کی ایک تعلیم یہ ہے کہ استنجا میں پانی کے ساتھ ڈھیلے بھی استعمال کرنا چاہیئے، قرآن مجید میں ایسے لوگوں کی تعریف بیان کی گئی ہے، اور ڈھیلے طاق عدد میں استعمال کرنا چاہیئے، بعض روایات میں تین کا لفظ بھی موجود ہے، مقصد اس کا یہ ہے کہ خوب صفائی اور پاکیزگی حاصل کرنی چاہیئے۔ اور اطباء نے اس کے بہت سے فوائد بھی بیان کئے ہیں۔ جریان وغیرہ کے امراض دور ہوتے ہیں اور قوت مردانگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آج کے زمانے میں ٹشو پیپرس (Tissue papers) اور ٹوائلٹ پیپرس (Toilet papers) ڈھیلے ہی کے حکم میں ہیں، استنجا کے وقت اگر آدمی ان کو استعمال کرلے تو وہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔

سنت پر عمل کرنے میں دین اور دنیا دونوں کا فائدہ ہے:

آپ ﷺ نے استنجا سے متعلق یہ ہدایات دی ہیں، اس کے علاوہ اور بھی ہدایات ہیں، میں نے ان میں سے صرف چند ہدایات کا ذکر کیا ہے، اب ذرا غور کیجئے کہ استنجا جس کو ہم معمولی سمجھتے ہیں لیکن نبی علیہ السلام کی اس میں کتنی ہدایات ہیں؟ اور ان کے فوائد کتنے عظیم ہیں؟ دیکھنے میں تو یہ معمولی عمل ہے، لیکن اس کے فوائد عظیم ہیں۔ تعلیمات نبوی میں یہی خصوصیت ہے کہ اس پر عمل کرنے سے دین کا فائدہ تو ہے ہی لیکن بے شمار دنیوی فائدے بھی اس میں مضمر ہوتے ہیں۔

دو کھجور ایک ساتھ کھانے کی ممانعت اور اس کی وجہ:

ایسے ہی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی آدمی دو دو کھجور ایک ساتھ اٹھا کر کھائے، مگر اپنے ساتھی کی اجازت سے۔ (صحیح بخاری: کتاب الشرکہ: ۲۴۸۹) مطلب اس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ کھا رہے ہوں، اور کوئی چیز عددی ہو، شمار کی جانے والی ہو جیسے بادام، انگور وغیرہ تو ان کو دو دو اٹھا کر نہیں کھانا چاہیئے، ہاں اگر ساتھی کی اجازت ہو تو کھا سکتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک تو اس کے ساتھی کا حق اس میں نہ مارا جائے، اور اس کی رعایت ہو، اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ خلافِ ادب اور خلافِ تہذیب ہے، کتنی باریک بات نبی ﷺ نے بیان فرمائی۔ (اکمال المعلم: باب نہی الآکل مع جماعۃ عن قران تمرتین ونحوھما، ۲۰۴۵)

خلال اور اس کے فوائد:

ایسے ہی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ اَکَلَ فَلْیَتَخَلَّلْ" (سنن دارمی: کتاب الاطعمۃ: ۲۰۸۷) اسی طرح ایک جگہ ارشاد ہے: "رَحِمَ اللّٰہُ الْمُتَخَلِّلِیْنَ وَالْمُتَخَلِّلَاتِ" (شعب الایمان: ۶۰۵۴)

جب کوئی کھانا کھائے تو چاہیئے کہ وہ خلال کرلے، اللہ خلال کرنے والے مردوں اور عورتوں پر رحم فرمائے۔ اس لئے خلال کرنا سنت ہے، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"فَمَا تَخَلَّلَ فَلْيَلْفِظْ وَمَا لَاكَ بِلِسَانِهِ فَلْيَبْتَلِعْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ" (سنن ابو داؤد: باب الاستتار فی الخلاء: ۳۵)

"جو آدمی خلال کرے تو اس کو پھینک دے، اور جو زبان سے چھڑالے تو اس کو نگل لے، جس نے ایسا کیا تو اس نے اچھا کیا اور جس نے اس طرح نہیں کیا تو اس پر کوئی گناہ اور حرج نہیں"

کتنی باریک اور نزاکت والی بات آپ نے ارشاد فرمائی ہے، آپ اپنے طور پر غور کرکے دیکھیں کہ جو چیز آپ زبان سے چھڑا لیتے ہیں وہ منھ ہی میں ہوتی ہے، باہر نہیں آتی، اس کے کھانے میں اور نگل جانے میں بھی کوئی حرج نہیں، کوئی بد تہذیبی یا کراہت کا مسئلہ نہیں، لیکن اگر کوئی خلال کرکے کوئی چیز باہر نکالے اور اس کے بعد پھر اسی کو منھ میں ڈال لے اور چبا کر کھانے لگے تو کس قدر بد تمیزی اور بد تہذیبی معلوم ہوتی ہے؟ اور سامنے والوں کو کتنی گھن اور کراہت محسوس ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس طرح کے عمل سے منع فرمادیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے، اور عقل بھی یہی کہتی ہے۔

خُلالہ کو پھینکنے کی حکمت:

یہاں کسی کو یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ زبان سے خلال کرنے کے بعد جو چیز نکلی وہ بھی نعمت ہے اور جو خلال سے نکلی وہ بھی نعمت ہے، اور حضور ﷺ کی عادت شریفہ تھی "كَانَ يُعَظِّمُ النِّعْمَةَ وَاِنْ دَقَّتْ" (المعجم الکبیر: ۴۱۴) آپ ﷺ نعمت کی تعظیم فرماتے تھے خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو، اس لئے بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دونوں کو کھالینا چاہیئے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! جو منھ ہی منھ میں نکل جائے وہ نگل لیا جائے

اور جس کو خلال کر کے نکالا جائے تو اس کو پھینک دیا جائے، ایسا کیوں؟ اس میں تو نعمت کی ناقدری ہوتی ہے، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حکمت کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلال کرنے کے بعد خلالہ کے پھینکنے کا حکم دیا ہے اس لئے کہ جو چیز دانت میں پھنس جاتی ہے اور جس کو خلال کر کے نکالا جاتا ہے وہ بدبودار ہو جاتی ہے، اور گندگی اس میں پیدا ہو جاتی ہے، اس وجہ سے آپ نے اس کو پھینکنے کا حکم دیا، اور پھر آج اگر ڈاکٹرس سے تحقیق کروائیں گے تو پتہ چل جائیگا کہ اس میں اور کیا کیا حکمتیں اور راز ہیں؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر اس کو دانتوں میں ہی رہنے دیا جائے اس کی وجہ سے داڑھ کمزور ہو جاتے ہیں، اس وجہ سے اس کو نکال کر پھینک دینا چاہیئے، اور جو زبان ہی سے باہر آجائے اور اسے خلال کر کے نکالنے کی ضرورت نہیں ہے وہ چیز اچھی ہوتی ہے، نعمت ہوتی ہے اس لئے اسے کھالینا چاہیئے، اسے پھینکنے میں نعمت کی ناقدری اور ناشکری اور اسراف ہے، اور دیکھنے والوں کے لئے کراہت اور بدنمائی کی بھی بات نہیں ہے۔ (شرح ابو داؤد للعینی: رقم: ۲۴، باب الاستتار فی الخلاء)

غرض اتنی چھوٹی چھوٹی اور باریک باتیں اس دین میں بیان کی گئیں، لیکن غور کیا جائے تو یہ چھوٹی نہیں بلکہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں، دینی اعتبار سے اجر والی تو ہیں ہی لیکن جسمانی اعتبار سے بھی انسانوں کے لئے بہت ہی مفید ہیں، کسی اور مذہب میں اتنی تفصیل اور اتنی باریکیاں نہیں بتائی گئیں جتنا اس مذہب میں بیان کی گئیں، جس سے اس مذہب اور اس تہذیب کی جامعیت اور اس کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے، جب اس دین میں سب کچھ موجود ہے، اور زندگی کے ہر شعبہ میں امت کی رہنمائی کی گئی ہے، اور ہر شعبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہمارے لئے موجود ہیں، تو پھر ہم غیروں کا طریقہ کیوں اپناتے ہیں؟ ان کی تہذیب کیوں اپناتے ہیں؟ اور اس میں اپنی شان کیوں سمجھتے ہیں؟ میرے دوستو شان اور عزت اللہ نے اس راستے میں رکھی ہے، اس دین میں رکھی ہے،

غیر آج عزت کی زندگی گزار رہے ہیں تو ہمارے اصولوں اور ہماری تعلیمات کو اپنانے کی وجہ سے اور آج ہم رسوا ہو رہے ہیں تو ان کی تہذیب کو اپنا کر، اس لئے میرے دوستو! اس بے عزتی اور ذلت بھری زندگی کو ترک کریں، نبی کی سنت کو اپنائیں، اور اپنے آپ کو نبی والے سانچے میں ڈھالیں۔

دین پر چلنے اور استقامت کے لئے مجاہدہ اور عزم درکار ہے:

اب ظاہر ہے کہ اس راستے پر چلنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، بلکہ بہت مشکل کام ہے، ایک طرف نفس ہے تو دوسری طرف شیطان ہے، ایک طرف یہ خلافِ طبیعت وشریعت ہے تو دوسری طرف خاندان والوں کے طعنے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان سب چیزوں کو برداشت کرنا آسان نہیں ہے، بعض مرتبہ آدمی کی عادت شریعت کے بالکل اپوزٹ (opposite) بنی ہوئی ہوتی ہے، اس وقت سابقہ عادت کو چھوڑ کر شریعت پر چلنے کی عادت بنانا بڑا مشکل ہوتا ہے، اس کیلئے بہت سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے اپنے ارادوں کو قوی اور مضبوط بنانا ہوتا ہے، اور ان مخالف حالات میں اور آنے والی تکالیف میں صبر اور مجاہدہ سے کام لینا پڑتا ہے، تب کہیں جاکر شریعت پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے، اور استقامت نصیب ہوتی ہے، اور پھر راہیں کھول دی جاتی ہیں، اور آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی استقامت اور انعاماتِ خداوندی:

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا جو اصل کمال تھا وہ دین میں ان کی استقامت، مضبوطی اور پختگی ہی تھی، کیسی کیسی آزمائشیں ان پر آئیں؟ آگ کی سلاخوں سے انہیں داغا گیا، گرم جھلسا دینے والی ریت پر لٹایا گیا، باندھ کر باری باری مارا گیا، پتھر کی گرم سلیں سینے پر رکھی گئیں، بوریے میں لپیٹ کر دھواں دیا گیا، انگارے بچھا کر اس پر لٹایا گیا، جلاوطن کیا گیا،

جائیدادیں ہڑپ کی گئیں، مال لوٹا گیا، بیوی بچوں کو چھینا گیا، لیکن زبان سے صرف احد احد اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہیں نکلی، ان آزمائشوں اور تکالیف میں ان کا ایمان متزلزل نہیں ہوا، ان کے ایمان پر کوئی حرف نہیں آیا، بلکہ ایمان میں اور پختگی آئی، پھر اس کا ثمرہ اللہ نے انہیں دنیا ہی میں دے دیا، فتوحات اور رزق کے دروازے ان پر کھول دئے گئے، اور ایک ایک صحابی کا رعب بادشاہوں پر طاری کر دیا گیا، اور رہتی دنیا تک کے لئے ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی گئی، اور قرآن مجید میں ان کی خوشنودی اور کامیابی کا پروانہ جاری کر دیا گیا، لیکن اس کے لئے ان لوگوں نے قربانی دی، مجاہدے کئے ، مخالف اور سخت حالات میں صبر سے کام لیا، تب جاکر اللہ نے انہیں ان انعامات سے نوازا۔

میرے دوستو! ہمیں بھی یہ مزاج بنانا ہے، یہ ہمت پیدا کرنا ہے، ظاہر ہے کہ ہم تو ایسی آزمائشوں کے قابل اور متحمل نہیں ہیں، اس لئے اللہ سے عافیت کی دعا کرتے رہنا چاہیئے، لیکن اپنے دین وایمان میں کم از کم اتنی پختگی تو پیدا کرنا ہی چاہئے کہ کسی بھی حال میں ہمارے قدم نہ ڈگمگا سکیں، اور ایمان و سنت کا راستہ ہم سے چھوٹنے نہ پائے۔ اور ہر حال میں ہم اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے جھکے رہیں، اللہ پاک ہمارے دین و ایمان میں مضبوطی پیدا فرمائے، اور ہم پر دین اسلام کی حقیقت کو اور اس کی اہمیت کو اجاگر فرمائے، اور تادم آخر اسلام کے مطابق زندگی گزارنے اور اسی پر مرمٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اسلام پر ثابت قدم رہیں:

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ أَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ یُّرِدْ أَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَأَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَاءِ کَذٰلِکَ یَجْعَلُ اللّٰہُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ وَھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْآیَاتِ لِقَوْمٍ یَذَّکَّرُوْنَ۔ لَھُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَھُوَ وَلِیُّھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ‘‘ (الانعام: ۱۲۵ تا ۱۲۷)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتے ہیں اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان پر چڑھتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈالتا ہے۔

’’اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے، ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیات کو صاف صاف بیان کر دیا، ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے‘‘ برادران اسلام! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، فضل ہے کہ اللہ نے عافیت کے ساتھ ہماری ملاقات کروادی،

آپ حضرات کی دعاؤں سے سفر بخیر وعافیت اور آرام سے گزر گیا، آرام کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بڑی مصیبت نہیں آئی جو ناقابل برداشت ہو، ورنہ بیماریاں تو ساتھ ہیں، اور کچھ دوسرے مسائل ہیں، اور ایسی چیزیں تو ہر انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، اگر یہ نہ ہو تو پھر دنیا ہی نہ رہے، دنیا انہی چیزوں کا نام ہے۔

ہمارے ایک ساتھی ہیں جب کوئی اپنی پریشانی کا ذکر کرتا ہے تو کہتے ہیں، تین جگہیں ہیں، ایک جگہ وہ ہے کہ جہاں صرف پریشانی ہی پریشانی ہے وہ تو جہنم ہے، اور ایک وہ ہے کہ جہاں صرف مزے ہی مزے ہیں، وہ جنت ہے، اور ایک جگہ وہ ہے کہ جہاں کچھ پریشانی ہے اور کچھ مزہ ہے، کچھ تکلیفیں ہیں اور کچھ راحتیں ہیں، وہ دنیا ہے، اب بتاؤ، تم کہاں ہو؟ اگر دنیا میں ہو تو پھر ان دونوں چیزوں سے سابقہ پڑے گا۔

دنیا جائے آزمائش ہے:

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک سنت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک سیٹ اپ (Set up) ہے کہ ہر انسان کو دونوں طرح آزمایا جائے ، ہمارے اس دنیا میں بھیجے جانے کی بنیاد ہماری آزمائش ہے:

"اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا " (الملک:۲)

موت وحیات کی پیدائش ہی اس لئے ہوئی کہ اللہ تمہیں آزمائیں، تمہارا ٹسٹ لیں کہ اس آزمائش میں اپنے عمل میں کون صحیح رہتا ہے، اور کون غلط؟ آزمائش میں عمل کی صحت بنیادی چیز ہے، تکلیفوں میں اور نعمتوں میں آزمایا جانا ہر انسان کیلئے طئے ہے، غریب ہو کہ امیر ہو، امریکن ہو کہ افریقن ہو، انڈین ہو کہ پاکستانی ہو، بنگلہ دیشی ہو کہ نیپالی ہو، کالا ہو کہ گورا ہو، پڑھا لکھا ہو کہ بے پڑھا لکھا ہو، گاؤں کا ہو کہ شہری ہو، حاکم ہو کہ محکوم ہو، سب کے لئے یہ طئے ہے، یہی وجہ ہے کہ آدمی کو صرف مزے والی زندگی

ہی نہیں ملتی، بلکہ اس کے ساتھ مصیبتیں اور تکلیفیں بھی لگی ہوتی ہیں، بلکہ بعض دفعہ زیادہ مصیبتوں کی وجہ سے آدمی احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے، اور ہمیشہ غمگین نظر آتا ہے، اور اسے اپنے مستقبل میں روشنی کے بجائے تاریکی نظر آتی ہے، اور آگے بڑھنے سے وہ جھجکنے لگتا ہے، جب کہ اللہ پاک کی بے شمار نعمتیں اس پر ہوتی ہیں جن کا اسے استحضار نہیں ہوتا، اور جن مصیبتوں میں وہ مبتلا ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ بڑی بڑی مصیبتیں بھی ہوتی ہیں، جن کا اسے اندازہ نہیں ہوتا۔

غم اور خوشی نظامِ رب ہے:

یہ دونوں چیزیں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، در اصل یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نظام ہوتا ہے، ہر انسان کو خوش رکھنے اور اس کو رُلانے کا، ”وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ “(النجم: ۴۲)”اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور رلاتا ہے“

پہلے ہی سے رب نے کہہ دیا ہے کہ وہی رلاتا ہے اور وہی ہنساتا ہے، جتنی رونے کی باتیں یعنی مصیبت اور تکلیف، دکھ اور درد کے واقعات پیش آئیں، وہ سب اسی کی طرف سے ہوں گے، اور ان سے کوئی نہیں بچا سکتا ، اس کے ریزن اور اسباب کیا ہیں؟ اس کے کیا نتائج ہیں؟ وہ سب اس کو معلوم ہے، اور جتنی خوشی کی باتیں ہیں یعنی جن سے آدمی کو راحت اور سکون ملے اور اس کی تکلیفیں، مصیبتیں اور پریشانیاں دور ہو جائیں، وہ بھی اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہیں۔

غم اور خوشی کیوں؟

اگر غم ہی غم ہو اور تکلیف ہی تکلیف ہو تو انسان پر اس کا اتنا منفی اثر پڑے گا اور اتنا بوجھ اور ٹینشن (Tension) ہو گا کہ بالآخر وہ پاگل ہی ہو جائے، یا رحمت خداوندی کا انکار کر بیٹھے، اور اگر خوشی ہی خوشی ہو تو وہ رب کو بھول جائے اور اپنے مقصد حقیقی کو بھول

جائے۔ اس لئے یہ ایک نظام رب ہے، وہ خوشیاں بھی دیتا ہے اور غم بھی، تاکہ کچھ بیلنس رہے، اور رب سے اس کا تعلق بھی جڑا رہے۔ جب رب سے تعلق جڑ جاتا ہے تو آدمی مصیبت میں بھی لطف لینے لگتا ہے۔

آج لفظِ اسلام پر لوگ بہت ہی مصیبتیں اور پرابلمس کریٹ(Problems Crete) کر رہے ہیں، اور اتنے ھیڈ کس(Headache) ہو رہے ہیں کہ جن کا تصور مشکل ہے، جاب پر جائیں تو مسلمان ایک مسئلہ، سفر پر جائیں تو مسلمان ایک مسئلہ، امیگریشن پر مسلمان ایک مسئلہ، حج کے لئے جائیں تو مسلمان ایک مسئلہ، ہر جگہ مسلمان کا ایک اشو(issue) بنایا جارہا ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اسلم اور اہلِ اسلام کے لئے آزمائش ہے۔

لوگوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ ہم اسلام لائے ہیں اللہ پر، اور یہ مصیبتیں اور آزمائشیں بھی اللہ پاک ہی کی طرف سے ہیں، تو جس ذات پر ہم ایمان لائے اسی کی طرف سے مصیبتوں اور پریشانیاں سمجھ میں نہیں آتیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں اللہ پاک ہی ان مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ یہ بندہ مجھ پر ایمان لانے میں سچا ہے یا جھوٹا؟ خوشی میں کیا کرتا ہے اور غم میں کیا کرتا؟ ہے، مجھ سے تعلق قائم کرتا ہے یا مجھ سے تعلق توڑ لیتا ہے؟ اس طرح اللہ پاک بندہ کو آزماتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن مجید میں فرمایا:

"أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوْا أَنْ يَقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ" (العنکبوت: ۲و۳)

"(بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جاویں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جاوے گا اور ہم تو (ایسے واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) گزرے ہیں سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعوے میں) سچے تھے اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا"

یہ عشق نہیں فسق ہے:

زبانی جمع خرچ کرنے والے روڈ چھاپ عاشق بہت ہوتے ہیں، اسکول کی چھٹی ہونے کے وقت اسکول کے باہر لڑکے کھڑے ہوتے ہیں عاشق بن کر، ہمارے پاس ایسے عاشقوں کو روڈ چھاپ عاشق کہتے ہیں، ان میں سے دو چار کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے، اور دو چار جوتے مارتے ہی ان کا پورا عشق اتر جاتا ہے، یہ عشق نہیں بلکہ فسق ہوتا ہے، ہمارے استاذ محترم فرمایا کرتے تھے کہ یہ بس گندم کی گرمی ہوتی ہے، گیہوں کی روٹی زیادہ کھالی، انڈے زیادہ کھالئے، اب نفس انگڑائی لینے لگتا ہے تو باہر نکل جاتے ہیں، اور اپنے عشق کا اظہار کرنے لگتے ہیں، یہ عشق نہیں ہوتا، یہ زبانی جمع خرچ ہوتا ہے، اللہ پاک مسلمان کے ایمان کو دیکھتے ہیں کہ اس کا بھی ایمان ایسا ہی زبانی جمع خرچ والا ہے، یا حقیقۃً ہمارا عاشق ہے؟ زبانی دعوے ہیں یا حقیقت میں ایمان اس کے دل میں اترا ہوا ہے، اور وہ واقعتاً اللہ اور اس کے رسول کو ٹوٹ کر چاہتا ہے اور ان سے سچی محبت کرتا ہے یا نہیں؟ اس طرح ان مصیبتوں اور پریشانیوں کے ذریعہ اللہ پاک آزماتے ہیں اور ان سے بندہ کا ایمان اور اس کا معیار اور اس کے ایمان کی سچائی اور مضبوطی سامنے آجاتی ہے، اس موقع پر اسلام اور اسلامی تعلیمات پر جمے رہنا اہم ہوتا ہے، اگر آدمی یہ طئے کیا ہوتا ہے کہ مجھے ہر حال میں اپنے مولیٰ کو راضی کرنا ہے تو پھر وہ مولیٰ کی رضاء کی خاطر اسلام اور اس کی تعلیمات کو نہیں چھوڑتا، چاہے پوری دنیا ناراض ہو جائے، چاہے اس کا سب کچھ چھن جائے، بس اسے ایک ہی فکر سوار ہوتی ہے کہ اللہ راضی ہو جائے یہی اس کا ایمان ہوتا ہے، اور یہی چیز اللہ پاک بندے میں دیکھنا چاہتے ہیں، آج ہر مسلمان پریشان ہے، امریکہ کا ہو یا انڈیا کا، پاکستان کا ہو یا فلسطین کا، افغانستان کا ہو یا عراق کا، ایشیا کا ہو یا چائنا کا، سعودیہ کا ہو یا آسٹریلیا کا، اگر آپ اخبار پڑھیں گے تو یہی پڑھیں گے، بڑی نیوز بھی یہی ہوتی ہے، اور نمایاں نیوز بھی یہی ہوتی ہے، ہیڈ لائنس (Headlines) میں یہی بات آپ کو زیادہ ملے گی۔

حالات کمالِ ایمان کے لئے بھی آتے ہیں:

دوسری اہم وجہ اس کی یہ ہے کہ صبر اور شکر یہ دونوں ایمان کی خاص اور اہم صفات ہیں، اور ایمان کا کمال دونوں سے ہے، تو ناموافق حالات وواقعات اور تکالیف اس لئے بھی ہیں کہ ان پر صبر والی صفت حاصل ہو کر ایمان میں کمال آئے اور موافق حالات وواقعات اور نعمتوں سے شکر والی صفت حاصل ہو کر ایمان میں کمال آئے، اس طرح جتنا ایمان میں کمال ہو گا اتنے درجاتِ جنت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو گا، اس لئے اس دنیا میں ہر انسان کے لئے تکلیفوں اور نعمتوں دونوں کا نظام ہے۔

خطبہ میں جو آیت مبارکہ میں نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ پاک نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے کہ جس کے ساتھ وہ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، جس کو ہدایت دینے کا ارادہ فرماتے ہیں، اور جس کو صحیح راستہ پر چلانے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اسلام کے بارے میں مطمئن کر دیتے ہیں، اور اس کو شرح صدر عطا فرماتے ہیں۔ یعنی اسلام کے لئے اس کے سینے کو کھولدیتے ہیں، اور اس کے دل کو مطمئن فرمادیتے ہیں، اور اسے سکونِ قلب عطا فرماتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بہ آسانی اسلام کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور اسلام کی حقانیت پر اس کا دل مکمل طور پر مطمئن ہو جاتا ہے اور حق کی طرف بہت جلد راغب اور آمادہ ہو جاتا ہے، اور اسلام کے احکام پر عمل کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی، اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ حتی کہ اگر اس کو جلایا جارہا ہو، یا چیرا جارہا ہو، یا سولی پر چڑھایا جارہا ہو، یا اس کو قید کر کے اس کا کھانا پینا روک دیا گیا ہو، یا اس کے مال و دولت کو چھین لیا گیا ہو، یا اس کو جلاوطن کیا گیا ہو، یا اس کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا جارہا ہو تو وہ سب چیزوں کی تکلیف تو محسوس کرتا ہے، لیکن اس کو اس حالت میں بھی تسلی اور اطمینان ہوتا ہے۔

شرح صدر کا مطلب:

جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرح صدر کے بارے میں سوال کیا کہ یا رسول اللہ! شرح صدر کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نُوْرٌ يُقْذَفُ بِهٖ فِي الْقَلْبِ فَيَنْفَسِحُ لَهُ الْقَلْبُ'' (مصنف ابن ابی شیبۃ: کتاب الزھد: ۳۵۴۵۶) اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں، جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے، سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے، اور حق بات کو وہ آسانی سے قبول کرلیتا ہے اور خلاف حق سے اسے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے۔

شرحِ صدر کی علامات:

صحابہ کرام نے عرض کیا: ''يَا رَسُوْلَ اللهِ! هَلْ لِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ يُعْرَفُ''؟ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کیا اس کی کوئی علامت ہوتی ہے جس سے اس کو پہچانا جاسکے؟ آپ نے فرمایا: ''اَلْاِنَابَةُ إِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالِاسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ الْمَوْتِ'' (المستدرک علی الصحیحین: کتاب الرقاق: ۷۸۶۳) ہاں اس کی علامت یہ ہے کہ اس شخص کی رغبت ہمیشہ کے گھر جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے، اور دارالغرور یعنی دنیا اور دنیا کی خواہشات اور لذتوں سے وہ دور ہو جاتا ہے، اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے۔

صحابہ کرام کو یہ سعادت حاصل تھی:

اور یہ کیفیت اور یہ شرح صدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہو گیا تھا، ہمیشہ ان کی نظر آخرت پر ہوتی تھی، اسلام پر وہ مکمل مطمئن تھے، اور اسی وجہ سے اسلام کے بارے میں ان

کو شکوک وشبہات بھی بہت کم پیش آئے، کیونکہ رسول کریم ﷺ کے فیضِ صحبت سے وہ براہ راست مستفید ہوتے تھے، اور آپ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کا گہرا نقش ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا، جس کے سبب ان کو شرح صدر کا مقام حاصل ہو گیا تھا اور ان کے دل حق وباطل کا معیار بن گئے تھے، حق کو آسانی کے ساتھ قبول کرتے تھے، اور باطل کے لئے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی، پھر جوں جوں رسول کریم ﷺ کے زمانۂ مبارک سے دوری ہوتی چلی گئی، تو آہستہ آہستہ شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے، عقائد میں اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے، اور آج پوری دنیا کا حال یہی ہے۔

شرحِ صدر کے حصول کا طریقہ:

اس کے حصول کا طریقہ وہ ہے جو صحابہ کرام اور اسلاف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اللہ پاک کے انعام کا استحضار کر کے اس کی عظمت اور محبت دل میں پیدا کی جائے۔

اس کے علاوہ حق تعالیٰ سے دعا کی جائے، اسی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی ہے: ”رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ“ (طٰہٰ:۲۵) یعنی اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دیجئے۔

شرح صدر والی کیفیت:

جب شرح صدر حاصل ہو جائے تو پھر وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کو ایک ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے: ”رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِیْنًا، وَبِمُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نَبِیًّا“ (صحیح بخاری: کتاب العلم: ۹۴)

ہم راضی ہو گئے اللہ پاک کو رب مان کر، اور اسلام کو دین مان کر، اور محمد ﷺ کو نبی مان کر۔

اللہ کی ربوبیت پر راضی رہنے کا مطلب:

اللہ کو اپنا رب مان کر یعنی اس کی ربوبیت پر راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، کیونکہ وہی ہمارا رب ہے، نہ ہمیں کاروبار سے رزق ملتا ہے، اور نہ ہم کاروبار سے پلتے ہیں ہمیں رزق دینے والا اور پالنے والا اور ہمارے سب کاموں کو بنانے والا وہی ہے، اس لئے عبادت اسی کی کی جائے گی، اطاعت اسی کی کی جائے گی، اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جائے گا، چاہے کوئی بھی کام ہو اور کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو اسی کے دین پر اور اسی کے حکم پر جمے رہنا ہے، اسی کو شرح صدر کہتے ہیں۔

حضور کی نبوت پر راضی رہنے کا مطلب:

اس کے بعد حدیث میں فرمایا: ''وَبِالِاسلَامِ دِینًا'' اور دین اسلام پر ہم راضی ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کے احکام اور اس کی تعلیمات پر ہم راضی ہیں، اسی کو ہم مانتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی اور دین اور کسی مذہب کی تعلیمات نہ حق ہیں اور نہ ہم اس کو مانتے ہیں۔ ''وبمحمد نبیا'' اور محمد ﷺ کی نبوت پر ہم راضی ہیں، آپ کی نبوت پر راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں آپ کے طریقے کو اپنایا جائے، زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کے کلچر، آپ کی تہذیب، آپ کی عبادات، آپ کے اخلاق، آپ کی معاشرت اور آپ کے معاملات کو اپنایا جائے، اور اسی میں اپنی کامیابی اور عزت کو منحصر سمجھا جائے، جب یہ کیفیت کسی میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کو ایمان پر جمے رہنے میں مزہ آتا ہے، اور ہر چیز کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ تیار ہو جاتا ہے، اس کے بعد اسے نہ جان کی پرواہ ہوتی ہے، نہ مال کی، نہ بیوی بچوں کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ اعزہ و اقارب کی، بس اسے اللہ اور رسول کی پرواہ ہوتی ہے کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں، کہیں ان کے حکم کی

خلاف ورزی نہ ہو جائے، پھر بندہ اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے: ”فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ“

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ”وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ“ (الانعام:۱۲۵)

اور جس کو وہ بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان پر چڑھتا ہے“

ضیقِ صدر کا مطلب:

اللہ فرمارہے ہیں کہ جسکو میں ہدایت دیتا ہوں تو اس کے دل کی یہ کیفیت ہوتی ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا، اور جس کو گمراہ کرتا ہوں تو اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہوں، تنگ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ علماء نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ اسلام کی دعوت سنتے ہی اور اسلام کے احکام سنتے ہی اس کے دل میں گھٹن پیدا ہونے لگتی ہے، وہ اس میں غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا، اور اس کے اس رویہ سے یہ تنگی اور گھٹن مزید بڑھنے لگتی ہے۔ پھر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ حق اس کے دل میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، اس وقت اسے اسلام کی کامیابی سے اور اسلام پر عمل پیرا ہونے سے اتنی کوفت ہوتی ہے جیسے وہ بمشکل کسی بلندی یا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ رہا ہو اور اس کی سانس پھول رہی ہو، اس کے باوجود وہ بلندی پر چڑھنے کے لیے مجبور ہو۔

منافق کا دل حرجہ کی طرح ہوتا ہے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی لفظ ”حرجۃ“ کا ایک معنی منقول ہے کہ انہوں نے اس لفظ کی تحقیق کے لئے بنی کنانہ کے ایک شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ حَرَجَۃٌ کس

کو کہتے ہیں؟اس نے کہا: ’’اَلْحَرَجَۃُ فِیْنَا الشَّجَرَۃُ تَکُوْنُ بَیْنَ الْاَشْجَارِ الَّتِیْ لَا تَصِلُ اِلَیْھَا رَاعِیَۃٌ وَلَا وَحْشِیَّۃٌ وَلَا شَیْءٌ‘‘ (روح المعانی: ۱۸/۶) حرجۃ ہمارے ہاں اس درخت کو کہتے ہیں جو گھنے درختوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جہاں نہ کوئی چرواہا پہنچتا ہے اور نہ وحشی جانور اور نہ کوئی چیز، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’کَذَالِکَ قَلْبُ الْمُنَافِقِ لَا یَصِلُ اِلَیْہِ شَیْءٌ مِنَ الْخَیْرِ‘‘ منافق کا دل بھی ایسا ہی ہوتا ہے وہاں کوئی بھلائی نہیں پہنچ سکتی۔

مطلب یہ ہے کہ جب کوئی مسلسل اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اللہ پاک سے سرکشی کرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت اس کی طرف سے پھر جاتی ہے جس کی وجہ سے حق بات قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اس کا دل بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ حق کو تسلیم کرنے کا تصور کرتے ہی اس کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے جیسے کسی انسان کو آسمان کی طرف چڑھنے پر مجبور کیا جارہا ہو، جس طرح اس وقت اس کی سانس پھول جاتی ہے، اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور ایک بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح اس بدنصیب کا حال ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض تفسیروں میں لکھا ہے:

’’لَیْسَ لِلْخَیْرِ فِیْہِ مَنْفَذٌ‘‘ ’’یعنی اس کا دل اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ اس میں حق اور بھلائی کے لئے کوئی راستہ ہی نہیں رہتا‘‘

ذکر اللہ سے وحشت نفاق اور گمراہی کی علامت ہے:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ’’اِذَا سَمِعَ ذِکْرَ اللّٰہِ اشْمَأَزَّ قَلْبُہٗ وَاِذَا ذُکِرَ شَیْئًا مِنْ عِبَادَۃِ الْاَوْثَانِ ارْتَاحَ اِلٰی ذٰلِکَ‘‘ (تفسیر مظہری: ۲۸۸/۳)

سینہ کی تنگی کا مطلب یہ ہے کہ جب ایسا آدمی اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے، اور جب کفر وشرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگنے لگتا ہے۔

غرض اس کے سینے میں اللہ تعالیٰ یہ کیفیت پیدا فرمادیتے ہیں، اور وہ ہمیشہ ڈسٹرب (Disturb) رہتا ہے، اور اسے یہ وساوس آنے لگتے ہیں کہ نعوذ باللہ! کیوں میں

مسلمان ہوں؟ کیوں مسلمانوں کے ساتھ یہ پریشانیاں لگی ہوئی ہیں؟ کیوں مسلمانوں کے حالات درست نہیں ہیں؟ کیوں مسلمانوں کو ہر جگہ بے عزت اور رسوا کیا جاتا ہے؟ یہ سلسلہ کب تک ہوگا؟ غیروں کے طریقے اچھے ہیں، ان میں آزادی ہی آزادی ہے، اس طرح وہ اپنے مسلمان ہونے پر شرمندہ رہتا ہے، اپنی مسلمانی کو چھپانے کے مواقع دیکھتا رہتا ہے کہ کسی طریقہ سے میرا مسلمان ہونا پہچانا نہ جائے، میرا نام اندھیرے میں رہے، کوئی اپنا نام چینج (Change) کرتا ہے تو کوئی اپنا لباس چینج (Change) کرتا ہے، اور کوئی اپنا لائف اسٹائل (Life style) چینج (Change) کرتا ہے، سنت والی زندگی پر چلنے میں اسے عار محسوس ہوتا ہے، بے عزتی محسوس ہوتی ہے، اپنی قدر اور لوگوں میں اپنا مقام اور مرتبہ گرتا ہوا اسے محسوس ہوتا ہے، اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ یہ اس کے سینے کو تنگ کردینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

شرح صدر کب حاصل ہوتا ہے؟

صاحبِ تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ صوفیہ کے نزدیک شرحِ صدر اس وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس فنا ہوجائے، اور نفسانیت کا کوئی نشان باقی نہ رہے اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب ولایتِ کبریٰ یعنی ولایت انبیاء میں تجلّی صفات نمودار ہو، اس وقت حقیقی ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری: ۲۸۸/۳)

جس کو شرحِ صدر نہ ہو وہ ملعونِ خدا ہوتا ہے:

اس کے بعد فرماتے ہیں: ”كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ“ (جس طرح بے ایمان کا سینہ تنگ اور دل ایمان سے دور ہوتا ہے) اسی طرح ایمان نہ لانے والوں پر اللہ پھٹکار ڈالتا ہے۔

رجس کہتے ہیں ہر اس ناپسندیدہ چیز کو جس میں خیر نہ ہو، مفسرین نے اس کے معنیٰ عذاب، لعنت، رسوائی اور شیطان کے بیان کئے ہیں، (روح المعانی: ۱۸/۶ تفسیر طبری: ۱۱۱/۱۲)

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت میں لعنت بھیجتے ہیں اور ان پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں اور وہ ان کو بہکاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے حق بات ان کے دل میں نہیں اُترتی اور برائیوں کی طرف وہ دوڑنے لگتے ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ"

"اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیات کو صاف صاف بیان کر دیا"

یعنی اسلام والا راستہ سیدھا راستہ ہے، قرآن والا راستہ سیدھا راستہ ہے، اس میں کوئی کجی نہیں ہے، اس کے علاوہ جتنے راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے راستے ہیں۔ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے اور قرآن وحدیث سمجھنے والوں کے لئے ہم نے اس کو کھول کھول کر بیان کیا ہے، تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں، اور اس کو سمجھ کر قبول کرلیں۔

اسلام پر چلنے کے دو انعام:

"لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

"ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے"

جو لوگ اسلام قبول کرلیں گے اور اس پر سخت سے سخت حالات میں جمے رہیں گے اور اسلام کا دامن نہیں چھوڑیں گے، نبی کی سنتوں کو نہیں چھوڑیں گے تو ان کے لئے اللہ پاک نے دو اجر بیان کئے ہیں، (۱) ایک یہ ہے کہ ان کو دارالسلام ملیگا۔ (۲) اور دوسرے یہ کہ اللہ کی محبت ان کو ملے گی۔

دار السلام سے مراد جنت ہے، علماء نے لکھا ہے کہ سلام سے مراد اللہ اور دار سے مراد گھر ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو اللہ کا گھر دیا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت

اس کی عظمت بتانے کے لئے کی گئی ہے۔ یا پھر سلام جنت کی صفت ہو گا، مطلب یہ ہے کہ سلامتی والا گھر یعنی جنت ان کو دی جائے گی۔ (تفسیر طبری: ۱۲/ ۱۱۴ ونسفی: ۱/ ۳۴۸) اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے۔

جنت کو سلامتی کا گھر اس لئے کہا گیا کہ وہاں ہر آفت، ہر پریشانی اور ہر غم سے سلامتی رہے گی، وہاں فرشتوں کا سلام ہوتا رہے گا، وہاں راحت ہی راحت ہو گی، دنیا میں چونکہ وہ راحت میں نہیں تھا، اس کے لئے کئی مسائل تھے، کئی پریشانیاں تھیں، وہ آزاد نہیں تھا کہ خواہشاتِ نفسانی پر چلتا، بلکہ دین کے حدود میں قید تھا، نبی والے طریقے پر تھا، صراط مستقیم پر گامزن تھا اور پھر دنیوی اعتبار سے بھی پریشان تھا، مسلمان ہونے کی وجہ سے نہ جان کی سلامتی تھی، نہ مال کی سلامتی تھی، نہ عزت کی سلامتی تھی، نہ جاب کی سلامتی تھی، نہ تعلقات کی سلامتی تھی، ہمیشہ ایک خوف تھا، اور ایک الجھن تھی، اس لئے جب وہ اس گھر میں داخل ہو گا تو وہاں صرف سلامتی ہی اس کو ملے گی، سلامتی کا گھر ہی اس کو دیا جائے گا۔ وہاں سننے میں سلامتی ہو گی، دیکھنے میں سلامتی ہو گی، بولنے میں سلامتی ہو گی، رہنے میں سلامتی ہو گی، دوستوں میں سلامتی ہو گی، ہر ہر چیز میں سلامتی ہو گی۔ کبھی کوئی غم اس کے پاس نہ پھٹکے گا۔ الغرض اس گھر کا نام سلام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو گا تو وہ ہر آفت اور ہر پریشانی سے محفوظ ہو جائے گا۔ اور اس میں داخل ہونے سے اسے سلامتی مل جائے گی۔ (تفسیر بغوی: ۳/ ۱۸۸)

دوسرا انعام:

اللہ پاک کی جانب سے دوسرا انعام یہ ملے گا کہ اللہ پاک اس بندہ کے ولی ہو جائیں گے، مطلب یہ ہے کہ اس سے محبت کریں گے، اس کے دوست بن جائیں گے، اس کے محافظ اور مددگار بن جائیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۳۳۸ ونسفی: ۱/ ۳۴۸)

اور مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیں گے، پھر زمین میں اس کو اپنا خلیفہ بنادیں گے۔ ایک ہے ہمارا اللہ کو چاہنا، اور ایک ہے اللہ پاک کا ہم کو چاہنا، یہاں اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ میں اس کو چاہوں گا، میں اس کو اپنا محبوب بنالوں گا، میں اس کا محافظ بن جاؤں گا، میں اس کا مددگار بن جاؤں گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اللہ پاک کسی کے ولی بن جائیں، یہ اللہ پاک کی طرف سے بہت بڑا انعام ہے۔

یہ دو انعام کیوں ملیں گے؟ اس وجہ سے کہ وہ دنیا میں اسلام پر راضی تھا، اور اسلامی احکام پر عمل پیرا تھا، نبی والے طریقے پر تھا، سنت والی زندگی گزارتا تھا، اس وجہ سے اللہ پاک اس کو ان دو انعامات سے نوازیں گے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے انعامات قرآن وحدیث میں بیان کئے گئے ہیں، لیکن اس جگہ خاص طور پر دو انعام بیان کئے گئے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ہر حال میں اسلام پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

عظمتِ الٰہی اور اس کا استحضار

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ”سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی“ (الاعلیٰ: ۱)

اے پیغمبر ﷺ! آپ اپنے پروردگارِ عالیشان کے نام کی تسبیح بیان کیجیے۔

”تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ“۔ (الرحمن: ۷۸)

بڑا بابرکت نام ہے تیرے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے۔

برادرانِ اسلام! ایک اہم بات جس کے ہمارے ذہن میں نہ ہونے کی وجہ سے آج سارا معاشرہ بد عملی اور فسق و فجور میں مبتلا ہے، جس کی کمی ہم سب میں پائی جارہی ہے، اگر وہ ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو ہر آدمی بلکہ سارے معاشرہ کی اصلاح ہو جائے، اور وہ ہے ہم میں باری تعالیٰ کی عظمت کا فقدان اور اس کا عدمِ استحضار۔

زندگی گزر گئی لیکن اللہ کا نام لینا نہیں آیا:

اس کو اس طرح سمجھیں کہ ہر شئ کا ایک نام ہوتا ہے، ”نام“ کو عربی میں ”عَلَم“ کہتے ہیں، ”علم“ کے معنیٰ نشانی کے آتے ہیں، اور نشانی کے ذریعہ چیز کا تعارف ہوتا ہے، اور چیز پہچانی جاتی ہے، اور اس کا ذکر کرتے ہی اس کی خصوصیات، اس کے فوائد، اس کی اہمیت اور اس کی عظمت ذہن میں آجاتی ہے، جیسے یہاں فیان (Fan) لگے ہوئے ہیں،

جب ہم فیان (Fan) کہتے ہیں تو اس کا ایک تصور اور اس کی خصوصیات ہمارے ذہن میں آتی ہیں، جب ہم گاڑی یا کار کہتے ہیں تو اس کا تصور، اس کی خصوصیات اور اس کے فوائد ذہن میں آتے ہیں، ایسے ہی اگر مکان کہیں گے تو مکان کا ایک خاکہ ذہن میں آتا ہے، کھڑکیاں، دروازے، ہال، کچن، کلر، ڈیزائن غرض ان پوری چیزوں کا تصور ذہن میں آتا ہے، بے جان چیزوں سے ہٹ کر اگر آپ کسی آدمی کا تصور کریں تو اس کی خصوصیات، اس کے اوصاف ذہن میں آتے ہیں، اگر وہ باکمال ہو، ڈگریاں اور عہدے اس کے ساتھ ہوں تو اس کے نام کے ساتھ اس کے یہ اوصاف و کمالات اور اس کی بڑائی اور عظمت ذہن میں آتی ہے، جیسے اگر ہم کسی حکومت کے عہدیدار، یا صدر، یا وزیر، یا لیڈر کا ذکر کریں گے تو اس کے ساتھ اس کے پاور (power) اور اس کی عظمت کا بھی تصور ذہن میں آتا ہے، یہ تو مادی دنیا میں ہمارا حال ہے، لیکن اگر ہم ان چیزوں کے خالق و مالک کا ذکر کریں اور اس کا نام لیں تو کبھی ہمارے ذہن و دماغ میں اس کی بڑائی، عظمت، کبریائی کا تصور نہیں آتا۔ گویا ہماری اتنی طویل زندگی تو گزر گئی لیکن آج تک ہمیں اللہ تعالیٰ کا نام تک لینا نہیں آیا۔ "کار" کہیں گے تو اس کا تصور ذہن میں آئے گا، مکان کہیں گے تو اس کا تصور ذہن میں آئے گا، دوکان کہیں گے تو اس کا تصور ذہن میں آئے گا، وزیر کہیں گے تو اس کا عہدہ اور منصب ذہن میں آئے گا، منسٹر کہیں گے تو اس کا عہدہ اور منصب ذہن میں آئے گا، لیکن اگر اللہ کہیں گے تو اس کی بڑائی اور عظمت ذہن میں نہیں آئے گی۔

محض علم کافی نہیں استحضار چاہئے:

اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس ذات کی عظمت اور کبریائی ہمارے ذہنوں میں جیسی ہونی چاہئے ویسی نہیں ہے، اس کا ہمیں علم تو ہے لیکن وہ کافی نہیں بلکہ اس کا استحضار چاہئے، استحضار نہ ہونے کی وجہ سے ہی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں، گناہوں کی جرأت اور ہمت ہو رہی ہے، اعمال میں سستی اور غفلت ہو رہی ہے۔ اگر اس کی عظمت

اور بڑائی کا استحضار ہو جائے تو پھر یہ غفلتیں بھی ختم ہو جائیں گی، برائیوں سے بچنا بھی آسان ہو گا، اور پھر اس کا نام لینے میں بھی مزہ آئے گا، اور اسی طرح اس کے اثرات اور انوارات بھی مرتب ہوں گے۔

میرے شیخ حضرت مسیح الامت کا ایک ملفوظ:

ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے ایک بات فرمائی تھی، وہ یہ کہ اللہ کی عظمت کے تصور کے بغیر جو ذکر ہوتا ہے اس میں اثر نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ ذکر تو کرتے ہیں لیکن اس کی عظمت اور بڑائی کا دھیان نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ذکر وہ ہے جو عظمت کے تصور کے ساتھ ہو، دھیان کے ساتھ ہو۔

اللہ کہتے ہیں ایسی ذات کو جس کا وجود ذاتی اور ضروری ہو اور جو تمام صفات کمال کی جامع ہو۔ (روح المعانی: ۸۸/۴) اور تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہو۔

اللہ کا نام لینے کا طریقہ:

اس لئے جب کوئی اللہ کا نام لے تو اس کے نام کے ساتھ اس کے کمالات، اس کی عظمت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی حکمت، اس کی ربوبیت، اس کی خالقیت، اس کی مالکیت، اس کی رزاقیت، اس کی حفاظت کا تصور بھی ذہن میں ہونا چاہئے۔

اس کے نام کے ساتھ یہ بھی ذہن میں ہونا چاہئے کہ وہ ذات سب کی خالق ہے، سب کی رب ہے، وہ جس کے ساتھ جب چاہے جیسا چاہے سلوک کر سکتا ہے، سب اس کے کنٹرول اور قبضہ میں ہیں، کوئی چیز بھی اس کی قدرت اور قبضہ سے باہر نہیں ہے، دوکان، مکان، صحت، بیماری، عزت، ذلت، دولت، غربت، سب اس کے ہاتھ میں ہے، لفظ اللہ کے ساتھ کچھ اس طرح کے تصورات جمانے کی ضرورت ہے، اس تصور کے

ساتھ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو انسان عظمتِ الٰہی میں ڈوب جاتا ہے، اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے، دل پگھلنے لگتا ہے، تکبر اور انانیت ختم ہونے لگتی ہے، اپنی نفی اور اللہ تعالیٰ کا اثبات ہوتا ہے، پوری کائنات نفی اور اثبات کا مجموعہ ہے "لا الٰہ" سے مخلوق کی نفی یعنی مخلوق کی قدرت کی نفی، ربوبیت کی نفی، کمال کی اور صفاتِ کمال کی نفی، حاکم اور مالک ہونے کی نفی ہوتی ہے، اور "الا اللہ" سے خالق کے لئے ان کا اثبات ہوتا ہے۔

اللہ کی عظمت و کبریائی:

قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے اپنی بڑائی اور اپنی کبریائی کو بار بار ذکر فرمایا: "هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ" (الفاطر:۳) کیا اللہ کے علاوہ کوئی خالق اور ہے؟ وہ "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے، "يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ" (المائدہ:۱) جو چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ اور جب کوئی چیز چاہتا ہے تو بس اس کا ارادہ کافی ہوتا ہے "اِنَّمَا اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" (یس:۸۲) جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا معمول یہ ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ نہ کسی مٹیریل کی ضرورت پڑتی ہے، نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے، نہ کسی قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، جس ترتیب سے، جس وقت اور جس زمانہ میں، جس کے ساتھ جو ارادہ فرماتے ہیں وہ پورا ہو جاتا ہے، اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ معلوم کے مخلوق ہونے کیلئے اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے۔ "لِلّٰهِ الْمُلْكُ" (التغابن:۱) اللہ ہی کی سلطنت ہے، اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان میں اسی کا راج ہے، "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (الغافر:۶) آج کس کا راج ہو گا؟ اس ایک اللہ کا جو اکیلا ہے، دباؤ والا ہے۔ "لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (المائدہ:۱۲۰) اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ "مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" (ص:۶۵) بجز اللہ واحد غالب کے کوئی لائقِ عبادت نہیں۔

اللہ کا نام بھی برکت اور عظمت والا ہے:

یہ عظمت اور کبریائی صرف اس ذات کی نہیں ہے بلکہ اس ذات کے اسمِ مبارک کی بھی ہے، اسی وجہ سے سورۂ رحمن میں اللہ پاک نے فرمایا: ”تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ“ تیرے رب کا نام بہت برکت والا، بہت بزرگی والا اور عظمت والا ہے، اللہ پاک خود یہاں اپنے اسمِ مبارک کی اہمیت اور عظمت کو بتارہے ہیں کہ میرا نام بہت برکت والا، بزرگی والا اور عظمت والا ہے۔

اللہ کا اسم مبارک آسمان وزمین کے مقابلہ میں بھاری ہے:

اسی وجہ سے احادیث میں ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا وزن ساتوں آسمانوں و زمین کے وزن سے زیادہ ہے۔ اگر ایک پلڑے میں یہ رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں ساتوں آسمان اور زمین رکھ دئے جائیں تو ساتوں آسمان وزمین والا پلڑا ہلکا ہونے کی وجہ سے اُڑنے لگے گا، اور اللہ پاک کے اسم مبارک کے پلڑے کا وزن بھاری ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے: سُبْحَانَ اللّٰہِ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَاللّٰہُ أَکْبَرُ تَمْلَأُ مَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“ (مسند احمد: ۱۸۲۸۷) سبحان اللہ نصف میزان کو بھر دیتا ہے، اور الحمد للہ مکمل میزان کو بھر دیتا ہے، اور اللہ اکبر آسمان وزمین کے درمیان سب کو بھر دیتا ہے۔ ان کلمات کا اتنا ثواب کیوں ہے؟ یہ اتنے عظیم کیوں ہے؟ اس وجہ سے کہ اس میں اللہ پاک کا اسم مبارک ہے، اس میں اللہ پاک کی حمد اور بڑائی بیان کی گئی ہے، اس کا نام لینے کی یہ برکت ہے، اس ذات کا اسمِ مبارک آسمان وزمین کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ جب اس کے اسمِ مبارک کی یہ شان ہے تو اس ذات کی کیا شان ہوگی؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس پر عظمتِ الٰہی کا انکشاف ہوجائے تو باوجود مغفرتِ ذنوب کے اسے پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً، وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا" (صحیح بخاری: کتاب الرقاق: ۶۴۸۵)

یعنی اگر تم وہ باتیں جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ رویا کرتے، اور یہاں کم ہنسنے سے مراد بالکل ہی نہ ہنسنا ہے۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت: ۸۹/۲۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عظمتِ الٰہی کا اثر:

یہی وجہ تھی کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر، قوی الایمان صحابی جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنت کا پروانہ سنا دیا تھا، اور آپ جنت میں ان کا محل دیکھ چکے تھے، اللہ کی رضا کا پروانہ انہیں مل چکا تھا پھر بھی کہتے تھے:

"لَوْ نَادىٰ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّكُمْ دَاخِلُوْنَ الْجَنَّةَ كُلُّكُمْ اَجْمَعُوْنَ إِلَّا رَجُلًا وَّاحِدًا لَخِفْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَنَا هُوَ" (کنز العمال: باب فضائل الصحابة: ۳۵۹۱۶)

کہ اگر آسمان سے یہ اعلان ہو جائے کہ تم سب کے سب جنتی ہو سوائے ایک شخص کے تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ ایک جہنمی شخص میں ہی ہوں، اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے قسم دلا کر پوچھتے تھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں جن منافقین کا نام بتایا ہے کہیں اس میں میرا تو نام نہیں ہے؟ (البدایہ والنہایۃ: ۱۹/۵) یہ کیفیت محض عظمتِ الٰہی کے استحضار کا اثر تھی۔

اللہ کی بڑائی نبی اور فرشتوں کی زبانی:

باری تعالیٰ کی اسی عظمت کے احساس اور استحضار کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں سال سے باری تعالیٰ کی عبادت میں مشغول فرشتے جب قیامت میں اپنے سر اٹھائیں گے تو کہیں گے "مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ" (شعب الایمان: ۱۶۶) جیسے آپ کی عبادت کی جانی چاہئے تھی ویسی ہم نے آپ کی عبادت نہیں کی۔ اور اسی وجہ سے مخلوقات میں سب سے افضل، سب کے امام، سب سے اعلیٰ جن کے صدقہ میں کائنات

کو وجود بخشا گیا، وہ فرماتے ہیں کہ ”مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ“ (روح المعانی: ۷۹/۴) آپ کی معرفت کا حق ہم نے ادا نہیں کیا۔ جب سب سے محبوب، سب سے اعلیٰ و افضل ہستی اور شخصیت ذاتِ الٰہ کے بارے میں یہ کہتی ہے تو اب اس کی عظمت کا اندازہ لگائیے کہ کیسی اس کی عظمت اور شان ہو گی؟

اللہ کے ہاں دنیا کی بے وقعتی:

میرے دوستو! وہ ذات بہت بڑی ہے، اس کا اسم بھی بہت بڑا ہے، اس کی قدرت بھی بہت بڑی ہے، کوئی پاور (power) اس کے سامنے کچھ نہیں، پوری دنیا کی بادشاہتیں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اس کے سامنے دنیا و مافیہا کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے:

”لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ مَا سَقٰی کَافِرًا مِنْھَا شَرْبَۃَ مَاءٍ“ (سنن ترمذی: باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ، ۲۴۹۰)

اگر دنیا کی اللہ پاک کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت ہوتی تو اللہ پاک کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتے۔ یہاں کی ساری سلطنتیں، حکومتیں، بادشاہتیں، سب اس کے سامنے ہیچ ہیں، اس نے ایسی ایسی مخلوقات بنائی ہیں کہ دنیا اس کے سامنے بالکل عدم کے درجہ میں ہے، حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونک دیں گے تو ساری کائنات اڑ جائے گی، زمین کیا چیز ہے؟ اس کا کوئی حساب ہی نہیں ہے، وہ تو ایک تنکا ہے، خس و خاشاک ہے، وہ سورج، کہکشاؤں، اور دیگر بڑے بڑے ستاروں کو جو زمین کے مقابلہ میں لاکھوں اور کروڑوں گنا بڑے ہیں اپنی ایک پھونک میں گرا دیں گے، اور ریزہ ریزہ کر دیں گے، جس ذات کی مخلوق کی یہ طاقت و قوت ہے تو اس مخلوق کے خالق کی کیا شان ہو گی؟ اس کی عظمت اور کبریائی کیسی ہو گی؟

نماز میں بار بار تکبیر کیوں؟

اسی لئے جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو ہمیں جھکتے، اٹھتے، بیٹھتے اللہ اکبر کہنے کا حکم دیا گیا کہ اللہ سب سے بڑا ہے، تاکہ ہمیں اس کی بڑائی کا استحضار ہو، ہم اللہ اکبر کہہ تو دیتے ہیں لیکن اس کی شانِ کبریائی کا ہمیں استحضار نہیں ہوتا، بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ جب لفظِ اللہ کہتے ہیں تو جیسے چیزوں کا تصور، اس کی خصوصیات اور اس کی اہمیت ذہن میں آتی ہے ایسے ہی اللہ پاک کے اسم مبارک کے ذکر کے وقت انہیں اس کی بڑائی اور عظمت کا استحضار ہوتا ہے۔

ذاتِ الٰہ کا تصور منع ہے قدرت و عظمت کا نہیں:

اللہ کی ذات کا ہم تصور تو نہیں کر سکتے، لیکن اس کی بڑائی، عظمت اور قدرت کا تصور تو کر سکتے ہیں، حدیثوں میں ہے:

"تَفَكَّرُوْا فِيْ آلَاءِ اللّٰهِ يَعْنِيْ عَظْمَتِهٖ، وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ" (شعب الایمان: ۱۲۰)

اللہ کی نعمتوں اور عظمتوں میں غور و فکر کرو، اللہ کی ذات میں غور و فکر مت کرو۔

"تَفَكَّرُوْا فِي الْخَلْقِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي الْخَالِقِ فَإِنَّكُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ قَدْرَهٗ" (کنز العمال: الفصل الثاني: في تعديد الأخلاق المحمودة، ۵۷۰۶)

مخلوق میں غور و فکر کرو، لیکن خالق کی ذات میں غور و فکر نہ کرو، کیونکہ تم اس پر قادر نہیں ہو۔

اس لئے اللہ کی عظمت کا دھیان، اللہ کی بڑائی کا دھیان، اللہ کی قدرت کا دھیان، اللہ پاک کی طاقت کا دھیان، اللہ کی ربوبیت کا دھیان، اللہ کی حفاظت کا دھیان، اللہ کے عزیز ہونے کا دھیان، اللہ کے حی اور علیم، حلیم اور کریم ہونے کا دھیان ہونا چاہئے۔

عظمت کا استحضار کیوں؟

کیونکہ جب تک عظمت و کبریائی دل میں پیدا نہ ہو اس وقت تک جذبات پیدا نہیں ہوتے، جب تک جذبات پیدا نہ ہوں تو طاعت نہیں ہو سکتی، کیونکہ جتنے ارادے اور

اعمال ہوتے ہیں وہ جذبات کے تابع ہوتے ہیں اور جذبات پیدا ہوتے ہیں محبت و عظمت کے پیدا ہونے سے، اس لئے جب تک اللہ اور اس کے رسول کی عظمت و محبت دل میں پیدا نہ ہو اس وقت تک ان کی اطاعت اور اتباع مشکل ہے۔

اذان اور نماز کا مقصد عظمتِ الٰہی کا اظہار بھی ہے:

دن میں پانچ مرتبہ اذان دی جاتی ہے، پہلے چار مرتبہ اور اخیر میں دو مرتبہ اللہ کی بڑائی کا اعلان ہوتا ہے، اس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اللہ پاک کی الوہیت اور وحدانیت کی گواہی دی جاتی ہے، اور پھر رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دی جاتی ہے، پھر اس کے بعد نماز ادا کی جاتی ہے، ان سب میں اللہ کی بڑائی اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے، نماز کے ایک ایک رکن سے عظمت الٰہی کا استحضار ہوتا ہے، اور دل میں بٹھانے کے لئے ہوتا ہے، بار بار اس کے ذکر سے اور اس کی توجہ دلانے سے اس کی وقعت اور عظمت دل میں بیٹھنا شروع ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ بڑھنے لگتی ہے، اور پھر اس کا استحضار پیدا ہونے لگتا ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی میں عبدیت اور بندگی کی شان پیدا ہونے لگتی ہے، اور یہی کیفیت در اصل مطلوب ہے، ہماری شان یہی ہونی چاہئے کہ ہم بندہ بن جائیں، عاجزی اور انکساری ہمارے مزاج میں پیدا ہو جائے، تاکہ اللہ پاک کے احکام قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ہمارے لئے آسان ہو جائے۔

عظمتِ الٰہی کے استحضار سے حضرت شیخ کی کیفیت:

ایک مرتبہ میں اپنے شیخ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت! اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت دل میں کیسے لائی جائے؟ وہ تو ولی تھے، جو دوسرے لوگوں سے بالکل ممتاز ہوتے ہیں، ان کے حالات الگ ہوتے ہیں، وہ کہنے لگے کہ عظمت دل میں کیسے لائی جائے؟ پھر فرمایا کہ عظمت من حیث الکمال ہوتی ہے، کمال کے اعتبار سے

عظمت دل میں پیدا کی جاتی ہے، پھر وہ تھر تھرانے اور کانپنے لگے، اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، حالانکہ وہ بہت ہی قوی المزاج تھے، روتے ہوئے ہم نے کبھی دیکھا نہیں تھا، مگر اللہ کی عظمت کے استحضار پر آنسو آگئے، جھرجھری سی آگئی، یہ اللہ والے تھے، باری تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کو وہ جانتے تھے، اس کا سوال ہوتے ہی ان کی کیفیت اور حالت بدل جاتی تھی، اسی لئے بار بار اللہ پاک کے کمالات اور قدرت کو بیان کیا جاتا ہے، تاکہ ہمارے اندر بھی وہ استحضار پیدا ہو۔

معاشرہ کی بد عملی کی ایک اہم وجہ:

معاشرہ کی بد عملی کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہی ہے کہ ہم میں اللہ اور اس کے رسول کی بڑائی اور عظمت نہیں ہے، اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم غیر شعوری طور پر آٹو میٹک (Autometic) مسلمان ہیں۔ الحمد للہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے مسلمان ہیں، لیکن اللہ اور رسول کو پہچان کر ہم نے اسلام قبول نہیں کیا ہے۔

جیسے دنیوی علوم و فنون میں کوئی ماہر ہو تو اس کی اولاد کو بھی وہی نام دے دیا جاتا ہے، لیکن جب تک وہ اس کو سیکھتا نہیں ہے اس وقت تک وہ حقیقت میں اس کا حامل نہیں ہوتا، ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر نہیں ہوتا، بلکہ اس کو علم حاصل کرنا پڑتا ہے، اگرچہ اس کو چھوٹے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، لیکن کوئی اس سے علاج کروانے نہیں آتا، کیونکہ وہ ڈاکٹر نہیں ہے، انجینئر کا بیٹا انجینئر نہیں ہوتا، لائر کا بیٹا لائر نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انجینئر اور لائر بننا پڑتا ہے، ایسے ہی ہمارا مسلمان ہونا بھی ہے، مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گئے اس لئے مسلمان ہیں، اگرچہ یہ بہت بڑی بات ہے، اور حق تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن ہماری کامیابی کے لئے اس طریقے سے مسلمان ہونا کافی نہیں ہے، جب تک کہ اسلامی صفات اور اسلامی اعمال ہمارے اندر نہ ہوں، اگر حقیقی مسلمان بننا ہے تو پھر اس کے لئے محنت کرنی پڑے گی، اسلام پر عمل پیرا ہونا پڑے گا۔

ہم میں اور نو مسلموں میں ایک فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ شعور کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، جو غیر شعوری طور پر مومن ہوتے ہیں وہ بہت حد تک خالی الذہن ہوتے ہیں، جب خالی الذہن ہوتے ہیں تو احکامِ الٰہی بجالانے کا جذبہ بھی ان کے اندر کم ہوتا ہے،، جو اللہ کی عظمت اور بڑائی کو جان کر اسلام قبول کرتے ہیں وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتے، حضراتِ صحابہ ﷺ کی بھی یہی کیفیت تھی، البتہ ایک بہت بڑی نعمت حضرات صحابہ کو یہ حاصل تھی کہ وہ براہِ راست نورِ نبوت اور فیضِ نبوت سے مستفید ہوتے تھے، اور وہ اس کے اہل بھی تھے، بعض دفعہ ہم کو بھی اس کا خیال آتا ہے کہ کاش ہم بھی سرکار کے زمانے میں موجود ہوتے، لیکن ہم اور ہمارے دل اس قابل ہی نہیں تھے کہ ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا جاتا، پتہ نہیں اگر اللہ پاک پیدا فرماتے تو ہمارا حال کیا ہوتا؟ وہ انہیں کا ظرف تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں سرکار کے زمانے میں پیدا کیا۔

دوسری بات یہ کہ ہم میں اور ان میں شعور اور غیر شعور کا بھی فرق ہے، اسی وجہ سے ان کے ایمان لانے کے بعد مخالفت کا تصور نہیں ہوتا تھا، چاہے کسی بھی حالت میں ہو، تنگی میں، خوش حالی میں، نعمت میں، مصیبت میں، بیماری میں تندرستی میں، عزت میں بے عزتی میں، اپنوں میں، پرایوں میں، معاملات میں، معاشرت میں کسی بھی چیز میں وہ اللہ اور رسول کی مخالفت نہیں کرتے تھے، کیونکہ اللہ کی عظمت، محبت اور بڑائی ان کے ذہن میں ہوتی تھی۔ لیکن ہم میں یہ کیفیت نہیں رہتی ہے، ہم غیر شعوری طور پر مسلمان ہیں، اس لئے ہمیں اللہ کی عظمت اور بڑائی کا شعور اور احساس نہیں، اب ہمیں نماز کا حکم دیا جاتا ہے، روزے کا حکم دیا جاتا ہے، زکوۃ اور حج کا حکم دیا جاتا ہے تو ہم میں اس حکم کی وقعت اور اہمیت نہیں ہوتی، ہم یہ سوچتے ہیں کہ پڑھیں گے تو ثواب ملے گا، نہ پڑھیں گے تو کوئی پرابلم (problem) نہیں ہے، حلال اور حرام میں فرق کریں گے

تو ثواب ملے گا، اللہ راضی ہو جائے گا، نہیں کریں گے تو کوئی مسئلہ نہیں، وہ غفور الرحیم ہے، معاف کر دے گا۔ احکامِ اسلام کے بارے میں ہمارا یہ تصور ہوتا ہے، اور یہ غیر شعوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب عبادات میں ہمارا یہ حال ہے تو معاملات، معاشرت، تہذیب اور تمدن کا کیا کہنا، اس میں تو ہم صفر ہیں۔

حقیقی مسلمان تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ممتاز ہوتا ہے

میرے دوستو! اسلام ایک مکمل تہذیب و تمدن اور مذہب کا نام ہے، ایک لاکھ آدمی غیر مسلم ہوں ان میں ایک مسلم ہو تو وہ ایک لاکھ میں ایسا پہچانا جائے گا جیسے ہزاروں کالے گھوڑوں میں ایک سفید گھوڑا پہچانا جاتا ہے، اس کو کہتے ہیں کلچر اور تہذیب کا تشخص، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ فتوحات کا زمانہ تھا، اللہ کے فضل سے ساری دنیا مسلمانوں سے مرعوب تھی، غیر مسلموں نے اس وقت اسلامی کلچر کو اپنا لیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں! اسلام قبول کرو پھر اسلامی کلچر اپناؤ۔ وہ فرق کرتے تھے کہ مسلمان الگ ہے، غیر مسلم الگ ہے، ہاں آپ کو اختیار ہے اس کلچر کو اپنانے کا، لیکن اس سے پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا، آج مسلمانوں میں عملی طور پر منافقت آگئی ہے، جس مذہب کو وہ مانتے ہیں اس کو فالو نہیں کرتے، اس میں ہم سب شریک ہیں، جس اللہ کی عظمت و کبریائی کو ہم جانتے ہیں اس کی بندگی کرنے کیلئے اگر طبیعت نہیں چلتی ہے تو اس کا نام منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اعتقادی منافقت تو اظہار سے معلوم ہوتی ہے، عملی منافقت تو کھلم کھلا ہے، ہر کوئی آسانی سے اس کو دیکھ سکتا ہے۔ اور یہ عملی منافقت ہم میں آرہی ہے ہمارے اندر شعور نہ ہونے کی وجہ سے، اللہ اور رسول کی عظمت اور بڑائی کا استحضار نہ ہونے کی وجہ سے۔

اللہ کی عظمت اور کبریائی پیدا کرنے کا طریقہ:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی عظمت، محبت اور کبریائی وغیرہ کیسے پیدا کی جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں مشق سے حاصل ہوتی ہیں، اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے پاس بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہوتی ہیں، اس کے کمالات میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہوتی ہیں، اس کے مالک اور حاکم ہونے کا تصور سے حاصل ہوتی ہیں، اس کے انعامات اور احسانات کو یاد کرنے سے حاصل ہوتی ہیں،، اپنی حیثیت اور حقیقت کو یاد کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے احادیث میں ہے:

"عَوِّدُوْا قُلُوْبَكُمُ التَّرَقُّبَ، وَاَكْثِرُوْا التَّفَكُّرَ وَالْاِعْتِبَارَ" (کنز العمال: ۵۷۰۹)

اپنے دلوں کو مراقبہ کی عادت ڈالو! اور اللہ کی عظمت اور قدرت اور کمالات میں کثرت سے غور و فکر کیا کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے:

"فِكْرَةُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً" (کنز العمال: ۵۷۱۰)

ایک ساعت (اللہ کی قدرت، احسانات، کمالات کے بارے میں) غور و فکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

ان روایات میں عظمت کے حصول کا طریقہ بیان کیا گیا ہے، جب تک اللہ کی عظمت اور محبت دل میں نہیں آتی ہے اس وقت تک اتباع مشکل ہوتی ہے، جب عظمت پیدا ہو جاتی ہے تو اتباع کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور احکام الٰہی پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے، اس لئے باری تعالیٰ کی عظمت اور اس کا استحضار پیدا کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

❊ ❊ ❊

اختیاری اور غیر اختیاری حالات میں کیسے رہیں؟

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

دو حالتوں سے انسان کو مفر نہیں:

برادران اسلام!

انفرادی زندگی اور خانگی حالات میں انسان کو جو الجھنیں پیش آتی ہیں وہ دو طرح کی ہیں، ایک اختیاری اور ایک غیر اختیاری، اختیاری الجھنوں سے آپسی تعلقات، میاں بیوی کی لڑائی اور جھگڑے، اولاد کی نافرمانی، آپس میں انڈراسٹینڈنگ نہ ہونا مراد ہے، بالخصوص معاملات اور تجارت میں جو باتیں پیش آتی ہیں زیادہ تر وہ بھی اختیاری ہوتی ہیں اور ایک قسم وہ ہوتی ہے جو غیر اختیاری ہوتی ہے، جیسے بیماری، آفت، مصیبت اور پریشانی کا آجانا، کاروبار میں نقصان ہو جانا، زراعت اور تجارت میں حادثہ کا پیش آجانا وغیرہ، یہ دو طرح کی چیزیں انسانوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور حق تعالیٰ کا نظام کچھ ایسا ہے کہ ان دونوں چیزوں سے انسانوں کو سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، شائد ہی کوئی دن ایسا جاتا ہے، جس میں ملنے جلنے والے یا مشورہ کیلئے آنے والے یا فون پر بات کرنے والوں سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کی نوبت نہ آتی ہو۔

بے اطمینانی کیوں؟

عجیب بات یہ ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ ہم مصیبتوں اور پریشانیوں کو جوڑتے ہیں جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو پھر بھی پریشانی باقی رہتی ہے، کچھ لوگوں کو دیکھا کہ اپنے مکان کے سلسلہ میں پریشان رہتے ہیں، غیر شرعی طریقے پر مکان لے لیتے ہیں اور اس کی قیمت ادا نہ ہونے سے پریشان رہتے ہیں، لیکن چند دنوں کے بعد مکان کی قیمت تو ادا ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی پریشان رہتے ہیں، کبھی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے یہ مشکلیں اور مصیبتیں آرہی ہیں لیکن جب اس کو ملازمت مل جاتی ہے پھر بھی پریشان رہتا ہے، کبھی بچوں کی شادیوں کو لے کر آدمی پریشان رہتا ہے، لڑکے کی شادی نہیں ہو رہی ہے، بیٹی کیلئے رشتے نہیں آرہے ہیں، ماں پریشان، باپ پریشان، گھر میں سب پریشان ہیں، بے چینی میں مبتلا ہیں، پھر چند دن کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ شادیاں بھی ہو گئیں ہیں لیکن مسئلہ جوں کا توں ہے، اور وہ پھر بھی پریشان ہیں۔

تقدیر نہ بدل سکتی ہے اور نہ چوک سکتی ہے:

در اصل دو باتیں یہاں غور کرنے کی ہوتی ہیں ایک تو یہ ہے کہ تقدیر کا لکھا نہ انسان بدل سکتا ہے اور نہ تقدیر کا لکھا انسان سے چوک سکتا ہے، اللہ نے انسانوں کی تقدیر بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ بنائی ہے، اور جو تقدیر بنائی ہے وہ بالکل اٹل ہوتی ہے، اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی، چاہے انسان کہیں بھی رہے لیکن اس کی تقدیر کا لکھا اس سے چوک نہیں سکتا، چاہے وہ امریکہ آجائے، یا انڈیا اور پاکستان چلا جائے، کہیں بھی وہ تقدیر سے باہر نہیں جا سکتا، تقدیر کا کوئی جز اس سے چھوٹ نہیں سکتا، کوئی بھی نوکری حاصل کر کے تقدیر سے باہر نہیں نکل سکتا، شادی کر کے کوئی تقدیر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک پہلو تو اس میں منجانب اللہ یہ ہے:

"مَاأَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ وَمَاأَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَکَ" (سنن ابو داؤد: کتاب السنۃ، ۴۷۰۲)

کہ جو چیز تمہیں پہونچ گئی وہ تم سے خطاء کرنے والی نہیں تھی، اور جو چیزیں تم سے خطا کر گئیں اور تم سے چھوٹ گئیں (یعنی ان کا نہ ملنا تقدیر میں لکھا ہے) تو وہ تمہیں پہنچ نہیں سکتیں، لیکن چونکہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ اس لئے ہمیں بھاگ دوڑ کرنے اور اسباب اختیار کرنے کا حکم ہے، لیکن اسباب اور ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد بھی مسبَب اور نتیجہ سامنے نہ آیا تو ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، اس کے بعد ہم مکلف نہیں ہیں، ایسے ہی اگر ہمارا مقصد پورا ہو گیا اور ہم مصیبت اور پریشانی سے بچ گئے تو یہ بھی "مَاأَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ وَمَاأَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَکَ" میں سے ہے۔

کہ جو چیز تمہیں پہونچ گئی وہ تم سے خطاء کرنے والی نہیں تھی، اور جو چیزیں تم سے سے چھوٹ گئیں یعنی ان کا نہ ملنا تقدیر میں لکھا ہے تو وہ تمہیں پہونچنے والی نہیں تھیں۔

فعل کی نسبت اپنی جانب کرنا غلط ہے:

یہاں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو پھنس جاتا، میں نے ایسا کیا اس لئے بچ گیا، بات در اصل یہ ہے کہ اس کی تقدیر میں بچنا ہی لکھا تھا، اللہ اسے بچانا چاہتے تھے اس لئے وہ بچ گیا، اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ نہیں بچتا، چاہے اس کے اسباب اختیاری پیش آئے ہوں یا غیر اختیاری، چونکہ بچنا مقدر تھا اس لئے وہ بچ گیا۔

تقدیر پر ایمان لانا ایمان کا رکن ہے:

کیونکہ ہمارا ایمان ہی اسی بات پر ہے، "أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ" (سنن ترمذی: کتاب الایمان، ۲۸۱۵) کہ جو کچھ اچھا برا انسانوں کو پیش آتا ہے وہ اللہ پاک کی طرف سے پیش آتا ہے، اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ایمان میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔

فرقۂ قدریہ اور حضور ﷺ کی پیشین گوئی:

امت میں ایک ایسا طبقہ بھی گزرا ہے جو تقدیر کا انکار کرتا تھا، اور ان کے بارے میں آپ ﷺ نے پہلے ہی سے پیشین گوئی فرمادی تھی: ''اَلْقَدَرِیَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَاِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ'' (سنن ابو داؤد: کتاب السنة، ۴۶۹۳)

فرقۂ قدریہ یعنی تقدیر کا انکار کرنے والے اس امت کے مجوسی ہیں، اگر وہ بیمار ہو جائیں تو تم ان کی عیادت مت کرو اور اگر مر جائیں تو تم ان کے جنازہ میں حاضر مت ہو۔

مسئلہ تقدیر ماوراء عقل ہے:

مسئلہ تقدیر کے انکار کی وجہ عقل کی اتباع ہے، کچھ شبہات ہیں، جس کی وجہ سے عقل اس مسئلہ کو سمجھنے سے قاصر ہے، اس لئے قرآن و حدیث سے ثابت اور بدیہی عقیدہ کا انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ یہ معاملہ عقل اور فہم سے ماوراء اور سمجھ سے بالاتر ہے، اور یہ عقل سے ماوراء کیوں نہ ہو؟

تقدیر اللہ کا بھید ہے:

کیونکہ تقدیر اللہ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے، اللہ کے اسرار میں سے ایک سر ہے، جب بندوں کے اسرار و رموز کو ہم نہیں جانتے ہیں تو خالق کے بھید اور اس کے اسرار و رموز کو کیسے جانیں گے؟ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اَلْقَدْرُ سِرُّ اللّٰهِ مَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ فَاَنَا بَرِیْءٌ مِنْهُ'' (کنز العمال: الفصل السادس فی الایمان بالقدر، ۴۸۵)

تقدیر اللہ کا راز ہے جو تقدیر کے اچھے اور برے ہونے پر ایمان نہ لائے میں اس سے بری ہوں۔

جب یہ اللہ کے اسرار اور اللہ کے رازوں میں سے ہے تو ہم کیسے اس راز کو سمجھ پائیں گے؟ بس اس پر ایمان لانا پڑے گا، چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہیں۔ اگر آپ اپنے

کسی دوست سے اس کا بھید پوچھیں کہ تیرا سیکریٹ کیا ہے؟ میں تیرے راز سے واقف ہونا چاہتا ہوں تو وہ راز نہیں بتائے گا، بلکہ آپ سے دوستی ختم کرلے گا کہ یہ کیسا دوست ہے؟ اگر کوئی غلام اپنے آقا سے کوئی راز پوچھے تو وہ اس کے چپت لگائے گا، بلکہ غلام کو اپنے آقا سے پوچھنے کی ہمت تک نہیں ہوگی، جب مخلوق میں ہمارا یہ حال ہے، دوست کے ساتھ ہمارا یہ حال ہے، اور غلام کو اپنے آقا سے کچھ پوچھنے کی تک ہمت نہیں ہے، تو ہمارا اپنے رب، اپنے مالک، اپنے حاکم اور اپنے خالق کے راز کو جاننے کی کوشش کرنا، ممانعت کے باوجود اس میں غور و فکر کرنا، اور سمجھ میں نہ آنے پر انکار کرنا کتنا برا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کتنی بد تمیزی اور بے ہودگی ہے، اسی واسطے جو آدمی تقدیر کے بھید میں جاتا ہے اس کے کفر کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اس موضوع پر بحث کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ:

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جن مسائل میں مجھے سب سے زیادہ شرح صدر حاصل ہے ان میں سے ایک تقدیر ہے۔ تقدیر کے استحضار سے دل کو اطمنان حاصل ہوتا ہے، تسلی ملتی ہے۔

تقدیر تسلی کا ذریعہ ہے:

مومنین کے لئے تقدیر میں بڑی تسلی ہوتی ہے، تقدیر کا بڑا فائدہ تسلی ہے، دنیا میں تقدیر ڈسٹرپ نہیں کرتی، اگر ڈسٹرپ کرتی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کے اندر کچھ کمی ہے، ایمان ابھی نامکمل ہے اس لئے یہ کیفیت ہے، یہاں تو وہی ہونے والا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرمادیا ہے، اور جو مقدر نہیں ہے وہ کبھی ہونے والا نہیں ہے، کسی چیز کے چھوٹ جانے پر یا کسی تکلیف اور مصیبت کے آجانے پر آدمی بڑا افسوس کرنے لگتا

ہے، اور بہت غمگین ہو جاتا ہے کہ میں نے کئی سالوں سے اس کے پیچھے محنت کی، کوشش کی، لیکن میرے ساتھ کیا ہوا؟ لیکن جو تقدیر پر پختہ یقین رکھتا ہے اور اسے اس کا استحضار ہوتا ہے تو اسے بڑی مصیبت اور تکلیف میں بھی تسلی ہو جاتی ہے، بلکہ مصیبت میں بھی وہ مطمئن ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ نے پہلے ہی سے لکھ دیا، اور جو کچھ لکھ دیا ہے وہ مجھ سے چوکنے والا نہیں تھا، اور اللہ کا فیصلہ اور ارادہ بندوں کے حق میں خیر ہی ہوتا ہے، اس لئے میری اس تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت اور بھلائی چھپی ہوئی ہے، اگرچہ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی ہے، یہ سوچ کر اس کو بڑی تسلی ملتی ہے، غم اور تکلیف ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور اسے اطمنان حاصل ہو جاتا ہے۔

بزرگوں نے فرمایا کہ ایک آدمی جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہو اور ایک آدمی جو تقدیر پر ایمان نہ رکھتا ہو جب دونوں کے ساتھ ایکول (Equal) قسم کا واقعہ پیش آجائے تو ایک آپ کو پریشان ملے گا اور ایک بے حد مطمئن ملے گا، عقلی اطمینان اس کو مل جائے گا، ایک ہوتا ہے عقل کا اطمینان اور ایک ہوتا ہے طبیعت کا اطمینان، عقلی اطمینان کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی جب یہ سوچے کہ اس میں اللہ پاک کی حکمت اور مصلحت چھپی ہوئی ہے اور اللہ پاک بندوں کے حق میں خیر ہی کو چاہتے ہیں اور اس چیز کے ملنے میں شاید مصلحت نہیں تھی، بھلائی نہیں تھی، اس لئے اللہ نے یہ چیز عطا نہیں فرمائی، اور امید ہے کہ اللہ پاک میری اس کوشش کا اجر اس سے بہتر اللہ پاک عطا فرمائیں گے، یہ سوچ کر اسے تسلی اور اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ ایک واقعہ اور حادثہ پیش آیا، اور تکلیف اور مصیبت پہنچی ہے، اس لئے طبیعت میں کچھ انقباض ہوتا ہے، طبیعت کچھ بوجھل ہوتی ہے، تو یہاں اس کو عقلی اور دماغی طور پر تو سکون ہے، تسلی ہے، لیکن طبعی طور پر یہ کیفیت نہیں ہے۔

جس آدمی کا تعلق اللہ کے ساتھ جتنا زیادہ جڑا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی وہ تسلی اور اطمینان سے رہتا ہے، اور اتنا ہی بڑی سے بڑی مصیبتیں بھی اس کے لئے آسان ہو جاتی ہیں، اسی

وجہ سے ہر مسلمان کو اللہ کی قدرت، اللہ کی حکمت، اللہ کی بڑائی، اللہ کی رحیمیت، اللہ کی حفاظت، اللہ کے مختار کل ہونے، اور قادر مطلق ہونے کا دھیان رکھنا چاہئے، وہ جب چاہیں جو چاہیں جس کے ساتھ چاہیں جیسا چاہیں کرسکتے ہیں، وہ بڑے مہربان ہیں، بڑے رحیم ہیں، بہت محبت والے ہیں، بہت چاہنے والے ہیں، بہت حفاظت فرمانے والے ہیں، بندوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنے والے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بھلائی کرنے والے ہیں، ان چیزوں کا استحضار اور ان کا یقین دل میں بٹھانے کے لئے ان سب چیزوں کا مذاکرہ بھی کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ پیش آنے والے واقعات پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس سے ایک تسلی کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ ہمارے عقائد میں سے ہے۔ اس پر یقین تو ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں، لیکن چونکہ اس کے استحضار سے تسلی بھی رہتی ہے اس لئے اس کی ترغیب دی جارہی ہے کہ ہر چیز میں اللہ کی ذاتِ عالی پر بھروسہ کیا جائے، اور ہر معاملہ کو اسی کے سپرد کیا جائے، اور یہی ہر مصیبت اور پریشانی کا واحد علاج ہے کہ انسان اپنے آپ کو مکمل اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہے، اور اسی میں اپنی مصلحت اور خیر خواہی سمجھے، ہاں فزیکلی (Physically) طور پر تکلیف ہوگی، کیونکہ منشاء کے خلاف کام ہوا ہے، طبیعت کے خلاف کام ہوا ہے، تکلیف پہنچی ہے، لیکن یہ مضر نہیں ہے، بس تقدیر اور فیصلۂ خداوندی پر راضی رہنا چاہیئے۔

حضرت ابراہیم کا انتقال اور آپ ﷺ کی کیفیت:

اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا'' یہ الفاظ آپ نے اس وقت کہے تھے جب آپ ﷺ اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کو اپنی گود میں لئے ہوئے تھے، ان کی طبیعت خراب تھی، جانکنی کا وقت تھا، روح پرواز کررہی تھی، جیسے ہی ان کا وصال ہوا آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

یہ رحمت ہے:

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے: یارسول اللہ کیا آپ بھی آنسو بہارہے ہیں؟ آپ نے کہا: ''یَا ابْنَ عَوْفٍ إِنَّهَا رَحْمَةٌ'' اے عبد الرحمن بن عوف! یہ رحمت ہے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ'' (صحیح بخاری: کتاب الجنائز، ۱۳۰۳)

بے شک آنکھیں آنسو بہارہی ہیں، اور دل غمگین ہورہا ہے لیکن پھر بھی ہم نہیں کہیں گے مگر وہ بات جس پر ہمارا رب راضی ہے، پھر آپ کہنے لگے کہ اے ابراہیم! ہم تمہارے فراق کی وجہ سے غمزدہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کی روح پرواز ہورہی ہے، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، ظاہر ہے کہ بیٹے کی روح باپ ہی کی گود میں نکلنے لگے تو باپ کی تکلیف اس وقت کیا ہوگی؟ اس وقت کتنا غم اور کتنی تکلیف ہوگی؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ رب سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے، رب جو کرے گا ہم اس پر راضی ہیں، اس کے فیصلہ پر ہم راضی ہیں، ہم اس غم اور صدمہ میں ایسی بات نہیں کہیں گے جو رب کی مرضی کے خلاف ہو، اور رب کو ناراض کرنے والی ہو۔ یہی رضا بالقضاء ہے۔

غیر اختیاری مصائب میں شریعت کا حکم

مصیبت اور تکلیف میں شکوہ شکایات کرنا، نازیبا الفاظ کہنا، اللہ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کرنا یہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے، بلکہ عقیدۂ تقدیر مستحضر نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

مصائب میں ہمارے لئے شریعت کا جو حکم ہے اس پر عمل کریں، مثلاً کسی کے انتقال یا کسی نقصان کی صورت میں یہ دعا پڑھنے کا حکم ہے: ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ'' (البقرۃ: ۱۵۶)

'' ہم تو (مع مال و اولاد حقیقتاً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں''

اس دعا کو پڑھیں، صبر کریں، اللہ سے عافیت کو طلب کریں، معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیں، اور اللہ کے فیصلہ پر راضی رہیں۔ اس سے مصیبت بھی ہلکی ہوتی ہے، آخرت میں اجر بھی ملتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی برکت سے دنیا ہی میں حق تعالیٰ اس سے بہتر بدلہ عطا فرمادیں۔

مصائب کے اسباب اختیاری ہوں تو ہمارا طرز عمل کیا ہو؟

یہ ہدایات تو اس وقت ہیں جب آدمی کے اوپر غیر اختیاری حالات آجائیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ حالات اور مصیبتیں وہ ہوتی ہیں جن میں خود بندہ کا عمل دخل ہوتا ہے، جیسے میاں بیوی میں لڑائی، باپ بیٹے میں لڑائی، بھائی بہنوں میں لڑائی، رشتہ داروں میں لڑائی، دوستوں میں لڑائی۔ ان میں بھی صبر سے کام لینا پڑتا ہے، اور ہر مصیبت اور تکلیف کو اللہ ہی کی جانب سے سمجھنا پڑتا ہے، اور اس پر راضی رہنا پڑتا ہے، لیکن چونکہ ان کے اسباب کچھ بندوں کے اختیار میں ہوتے ہیں اس لئے اس کے ساتھ ساتھ ایک اور کام بھی کرنا پڑتا ہے، وہ ہے اپنی تھوڑی قربانی، اپنا جھکاؤ، کچھ عاجزی، اور بڑے پن کی فنائیت اور وسعتِ ظرفی، جب یہ چیزیں اپنے اندر پیدا کی جاتی ہیں تو مصیبتیں اور پریشانیاں کنٹرول میں آسکتی ہیں، اس میں آدمی کو بہت سوچ سمجھ کر رہنا پڑتا ہے۔

چھوٹی مصیبت کو جھیل لینا بڑی مصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے:

ایک اصول اس موقع پر یہ ذہن میں رکھیں کہ جس وقت چھوٹی تکلیفیں پیش آتی ہیں تو اس چھوٹی سی تکلیف کو گوارا کر لینا چاہیے اس سے بڑی تکلیف دور ہو جاتی ہے، اگر اس چھوٹی تکلیف کو گوارا نہ کیا جائے اور اس وقت زیادہ ٹینشن لے لیا جائے اور اس کا ری ایکشن کیا جائے یا منفی تاثر دیا جائے تو پھر بڑی تکلیف کا اندیشہ ہوتا ہے، اور اس کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا پڑتا ہے۔

جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بنیادی چیز یہی ہوتی ہے کہ چھوٹی چیز کو گوارا نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے بات بڑھ جاتی ہے، مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں، بس ہر ایک کو تھوڑا کنٹرول اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے ساری لڑائیاں اور جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تھوڑا سا صبر اور تحمل نہ ہو تو دیکھیں حالات سامنے ہیں، تو تو' میں میں' شروع ہو جاتی ہے، ایک دوسرے کو برا بھلا کہا جاتا ہے، گالی گلوچ شروع ہو جاتی ہے، اور یہ گالی ایسی چیز ہے کہ اگر ایک مرتبہ نکلنا شروع ہو جائے تو پھر اس پر کنٹرول کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، جب تک زبان رُکی ہوئی ہے اسے روکے رکھنا چاہیئے، اگر زبان سے برا بھلا کہنا شروع کر دیا، گالی گلوچ شروع کر دیا تو پھر رکنے کا نام نہیں لیتی۔

کسی مسلمان کو گالی دینا:

زبان سے گالی دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ بہت برا عمل ہے، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ" (صحیح بخاری: کتاب الادب، ۶۰۴۴) کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور کسی مسلمان کو قتل کر دینا کفر ہے، گالی کا مطلب ہے ایسی بات کہنا جس سے سامنے والے کو تکلیف ہو، یہ اتنی سخت بات ہے کہ ہم کو اس کی برائی کا احساس نہیں، شوہر بیوی کو گالی دیتا ہے، اور بیوی شوہر کو گالی دیتی ہے، اس سے بات بڑھ جاتی ہے، اس کے لئے کسی کو قربانی دینی پڑتی ہے، کسی کو جھکنا پڑتا ہے، اگر دونوں اپنے غصے کا اظہار کرنے لگیں اور جو منہ میں آیا بکنے لگیں تو کبھی مار پیٹ کی نوبت آتی ہے، کبھی گھر سے چلے جانے کی نوبت آتی ہے اور کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے۔ ایسے موقع پر تھوڑا ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے، تھوڑا اپنے آپ کو سنبھالنا ہوتا ہے، تب جا کر مسئلہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں ٹریفک کی بد نظمی اور اس سے ایک سبق:

جب بھی ہم ہندوستان جاتے ہیں تو وہاں کی ٹریفک کی بد نظمی دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، اس کے باوجود بھی یہاں کے مقابلہ میں حادثات کم پیش آتے ہیں، اس میں گاڑی بھی ہوتی ہے، رکشہ اور سائیکل بھی ہوتی ہے، تین پہیے والا بھی ہوتا ہے، دو پہیے والا بھی ہوتا ہے، اور کبھی کبھی بیل بکریاں اور کتے وغیرہ بھی بیچ میں آجاتے ہیں، کمال یہ ہے کہ سب چلتے رہتے ہیں، اور ان میں حادثات بھی پیش آتے ہیں، چار حادثے ہوگئے تو اخبار میں آتا ہے کہ چار حادثے ہوئے، پورے شہر میں چار حادثوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں ہوتا، کیونکہ پورے حیدرآباد کی آبادی ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہے، اگر ساٹھ لاکھ کی آبادی ہو، اور اس پس منظر میں اگر چار یا پانچ حادثہ پیش آئیں تو ان کا کوئی شمار ہی نہیں، کیونکہ یہاں سب سے زیادہ اصول اور قوانین کی پابندی ہوتی ہے، اور یہاں اتنی آبادی نہیں جتنی وہاں کی ہے، نظام جتنا یہاں کا اچھا ہے وہاں کا نہیں، روڈ جتنے کشادہ یہاں کے ہیں وہاں کے نہیں، ریڈ لائٹ (Red light) ہوتی ہے اس پر رکنا ہوتا ہے، اور جو گرین لائٹ ہوتی ہے اس پر چلنا ہوتا ہے، یہاں اس کی بہت پابندی ہے، لیکن وہاں بعض مرتبہ بلکہ کئی مرتبہ کوئی اِدھر سے جارہا ہوتا ہے، اور کوئی اُدھر سے آرہا ہوتا ہے، نہ ریڈ لائٹ (Red light) کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ گرین لائٹ (Green light) کی، گاڑی ٹرن کرتے وقت نہ انڈیکیٹر (Indicator) کھلا ہوتا ہے، اور نہ ہاتھ سے کوئی اشارہ ہوتا ہے، اور نہ سائیڈ کے گلاس میں پیچھے اور دائیں بائیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان آنے والوں کی رعایت کا کوئی احساس اور خیال ہوتا ہے، اب آدمی کو یہ فیصلہ خود سے کرنا ہوتا ہے کہ وہ کیا کرنے والا ہے، مڑنے والا ہے یا نہیں، اس کو راستہ دینا ہے یا اُوَر ٹیک کرنا ہے، غرض ان سب کے باوجود یہاں حادثات زیادہ ہوتے ہیں اور وہاں کم، کیونکہ ایڈجسٹمنٹ (Adjustment)

ان میں کچھ زیادہ ہوتا ہے، اس طرف ان کا ذہن زیادہ چلتا ہے، ویسے یہ سب قدرت کی طرف سے طے ہوتا ہے، حفاظت کرنے والے اللہ پاک ہی ہیں، لیکن اسباب کے اعتبار سے اڈجسٹمنٹ ان میں زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اللہ پاک ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ غرض میرے دوستو! چھوٹی چھوٹی تکالیف پر راضی ہونا پڑتا ہے، تب جاکر مسائل حل ہوتے ہیں، لیکن ہم ان چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے انہیں کو بڑی بنادیتے ہیں، اس سے مسائل سلجھتے نہیں بلکہ الجھ جاتے ہیں، چین و سکون غارت ہو جاتا ہے، محبتیں نفرتوں میں بدل جاتی ہیں، گھر برباد ہو جاتے ہیں، لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں، چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے، گالی گلوچ ہوتا ہے، بدتمیزی اور بداخلاقی ہوتی ہے، اس طرح زندگی نہ چلتی ہے اور نہ گزاری جاسکتی ہے، اس کے لئے اپنے نفس کی قربانی دینی پڑتی ہے، بڑے پن کی قربانی دینی پڑتی ہے، تھوڑا بہت سن لینا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے ایک بہت بڑا مسئلہ سلجھ جاتا ہے، اور یہ بہت اہم چیز ہے کہ ہمارے آپسی تعلقات درست رہیں، آپس میں محبت رہے، نفرتیں ختم ہوں۔

نفل نماز اور روزوں سے بڑا عمل:

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، قَالَ: وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ" (سنن ابی داؤد: کتاب الادب، ۴۹۲۱)

کیا میں تم کو نماز اور روزہ سے بھی بہتر عمل نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا کہ کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپس کے تعلقات صحیح رکھنا، کیونکہ آپس میں بگاڑ اور تعلقات کا خراب کرنا یہ مونڈنے والی چیز ہے۔

تعلقات کا بگاڑ دین کی تباہی کا ذریعہ ہے:

دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"لَا أَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ" (سنن ترمذی: کتاب صفة القيامة، ۲۶۹۸)

میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ یہ سر مونڈنے والی ہے بلکہ یہ کہتا ہوں کہ یہ دین کو مونڈنے والی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دین باقی نہیں رہتا، دین تباہ و برباد ہو جاتا ہے، اب آپ اندازہ لگائیے کہ آپسی تعلقات کو استوار رکھنا کتنا بڑا نیک کام ہے۔ آپ ﷺ نے اسے نماز روزہ سے افضل قرار دیا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں نفل نماز اور نفل روزہ مراد ہے۔

اس لئے میرے دوستو ان سے بچنے کے لئے جو اسباب ہمارے اختیار میں ہیں کم از کم ان کو تو اختیار کرنا ہی چاہیئے، اور جو غیر اختیاری ناگوار حالات آجائیں تو ان میں اللہ کی ذات عالی پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہیئے، اور اسی میں اپنے لئے خیر اور مصلحت سمجھنا چاہیئے، اور ایسی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے جس سے آپس میں نزاع پیدا ہو، لڑائی اور جھگڑے پیدا ہوں۔

حق تعالیٰ ہم سب میں پیار و محبت کو قائم فرمادے، لڑائی جھگڑوں سے ہم سب کی حفاظت فرمائے، آپس میں اتحاد و اتفاق قائم فرمادے، اور نفرتوں اور عداوتوں کو ختم فرمائے۔ (آمین)

❊ ❊ ❊

آخرت کی تیاری کریں

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ”یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ“ (الحشر:۱۸ و ۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے۔ اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی، سو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پروا بنا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں۔

حق تعالیٰ کی بندوں پر شفقت اور مہربانی:

برادران اسلام! حق تعالیٰ شانہ اور ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ ہم پر، ہمارے بیوی بچوں پر، ہمارے خاندان پر ہم سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ بڑے ہیں، قدرت والے ہیں، طاقت والے ہیں، بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اس لئے ان کو ہماری کوئی پرواہ نہیں ایسی بات نہیں ہے، اتنے بڑے اور قدرت والے ہوتے ہوئے بھی وہ ہم

پر بڑے مہربان ہیں، ان کی شفقت اور مہربانیوں میں سے ایک مہربانی یہ ہے کہ انہوں نے آخرت کی ذلت اور رسوائی سے بچانے کے لئے اپنے احکام اور پیغامات دے کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے رسولوں کو بھیجا، اور رسول دنیا میں اللہ کے ترجمان بن کر تشریف لائے، اوران کا آنا اور پیغامات کا پہنچانا بھی ہمارے لئے شفقت ہی پر مبنی ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ شفیق نہ ہوتے اور مہربانی نہ کرتے تو رسولوں کو کیوں بھیجتے؟ اور جو کچھ حضور ﷺ کے پاس شفقت تھی وہ آپ ﷺ کی ذاتی تھوڑا ہی تھی؟ مخلوق کے پاس ان کی ذاتی کوئی چیز نہیں ہوتی، وہ تو اللہ کی عطاء ہوتی ہے، اس لئے یہ رحمت اور شفقت در اصل اللہ کی ہے، اور وہ بھی اتنی زیادہ کہ ہم خود اپنے اوراپنے بیوی بچوں پر اتنی شفقت نہیں کرسکتے، اسی لئے انہوں نے اپنے کلام میں بار بار ہماری تربیت فرمائی، ہماری ہدایت فرمائی، ہم پر مہربانی فرمائی، ہماری رعایت فرمائی، اور جگہ جگہ ہم کو متنبہ کیا، اس لئے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی جو باتیں ہیں، ان کی جو تعلیمات ہیں، اوران کی جو ہدایات ہیں، اوران کا جو طریقہ ہے وہ ہماری ہی بھلائی کیلئے ہے، اس میں ہمارا ہی نفع ہے، وہ ہماری شفقت کے پیش نظر ہے، اگر اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو ان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، ہمارا ہی نقصان ہے، انہوں نے وہ سب ہمارے فائدہ ہی کیلئے کہا ہے، اور ہماری اور ہمارے بال بچوں کی بھلائی ان سے زیادہ کون کرسکتا ہے؟ ان میں اور ہم میں اس معاملہ میں کوئی تقابل ہی نہیں ہوسکتا، چنانچہ جو آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں اسی مضمون کو اللہ تبارک وتعالیٰ بیان فرمارہے ہیں: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔

تحذیر بھی شفقت پر مبنی ہے:

ڈرنا کیوں ہے؟ ڈرنا اس لئے ہے کہ ڈر کے بغیر اللہ کے ہاں نقصان سے بچاؤ کی شکل نہیں ہے، اور اللہ پاک کا ڈرانا بھی شفقت ہی کی وجہ سے ہے، اگر وہ نہیں ڈرائیں گے تو

ہم کیسے ڈریں گے ؟اور جب ہم نہیں ڈریں گے تو مصیبت میں پڑ جائیں گے، کیونکہ وہاں صرف نعمتیں ہی نہیں ہیں، بلکہ نعمتوں کے ساتھ سزائیں بھی ہیں، کیونکہ کمال یہ ہے کہ جزا وسزا دونوں کا نظام ہو، اور نعوذ باللہ حق تعالیٰ ادھورے یا ناقص نہیں ہیں، کسی حکومت میں بہت زیادہ نرمی ہو، مہربانی ہو، اور وہاں کا سسٹم لوز (ڈھیلا) ہو، کوئی پکڑ دھکڑ نہ ہو، سخت قوانین نہ ہوں، چوروں کو نہیں پکڑا جاتا، بدامنی پھیلانے والوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے، تو کیا وہ گورنمنٹ مضبوط کہلائے گی؟ ظاہر ہے کہ ایسی گورنمنٹ ہرگز مضبوط نہیں کہلائے گی، وہ اس کے کمزور، عاجز ہونے کی علامت ہے، مضبوط حکومت وہ ہوتی ہے جس کے پاس دونوں نظام ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ تو قادرِ مطلق ہیں، اس لئے ان کے ہاں دونوں نظام ہیں، مہربانی، رحمت، شفقت، فضل انعامات وغیرہ اور دوسری طرف غضب، ناراضگی، سزا، جہنم وغیرہ۔ اس لئے انعام کے ساتھ ڈرنے کا بھی حکم دیا۔

انسان کی ایک خصوصیت:

اس کے بعد فرمایا: ”وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ“ ”اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے“

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جن خصوصیات سے نوازا ہے اس میں سے ایک نہایت ہی اہم ترین خصوصیت سوچنے کی، فکر کرنے کی، غور کرنے کی، انجام دیکھنے کی، اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی ہے، یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔

جزاء اور سزا عقل کے اعتبار سے ہے:

کمال کی بات یہ ہے کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پکڑ اور اس کا مواخذہ اس کی اسی صفت کی وجہ سے کیا جائے گا، اسے جو ثواب دیا جائے گا وہ اسی کی وجہ سے دیا جائے گا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی علیہ السلام نے فرمایا:

"لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ قَالَ لَهُ: قُمْ، فَقَامَ، ثُمَّ قَالَ لَهُ: أَدْبِرْ، فَأَدْبَرَ، ثُمَّ قَالَ لَهُ: أَقْبِلْ، فَأَقْبَلَ، ثُمَّ قَالَ لَهُ: أُقْعُدْ، فَقَعَدَ، ثُمَّ قَالَ لَهُ: مَا خَلَقْتُ خَلْقًا هُوَ خَيْرٌ مِنْكَ، وَلَا أَفْضَلُ مِنْكَ، وَلَا أَحْسَنُ مِنْكَ، بِكَ آخُذُ، وَبِكَ أُعْطِيْ، وَبِكَ أُعْرَفُ، وَبِكَ أُعَاقِبُ، وبِكَ الثَّوَابُ، وَعَلَيْكَ الْعِقَابُ" (شعب الإیمان: فصل فی فضل العقل، حدیث العابد والرمانة، ۴۳۱۳)

جب اللہ نے عقل کو پیدا فرمایا تو اس سے فرمایا: کھڑی ہو جا تو وہ کھڑی ہو گئی، پھر اس سے کہا کہ پیچھے ہٹ جا تو وہ پیچھے ہٹ گئی، پھر اس سے کہا کہ آگے بڑھ تو آگے بڑھ گئی، پھر اس سے فرمایا کہ میں نے تجھ سے بہتر کسی کو پیدا نہیں کیا، تجھ سے افضل میں نے کسی کو پیدا نہیں کیا، تجھ سے احسن میں نے کسی کو پیدا نہیں کیا، تیری وجہ سے میں پکڑوں گا، اور تیری وجہ سے ہی انعام دوں گا، تیرے ذریعہ ہی میں پہچانا جاؤں گا، اور تیری وجہ سے ہی میں جزا اور ثواب دوں گا، اور تجھ ہی پر سزا اور عذاب ہو گا۔

غور و فکر کی تاکید کیوں؟

یہ عقل اور غور و فکر کی صلاحیت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو دی گئی ہے یہ بہت بڑی نعمت ہے، اسی لئے قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں اس کو استعمال کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے، اور قرآن پاک میں بار بار اس کو ذکر کیا گیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ بار بار اس کی تاکید کیوں کی جارہی ہے؟ کیوں بار بار غور و فکر کا حکم دیا جارہا ہے؟ اور کن چیزوں میں غور و فکر کرنا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں غور و فکر کرنا ہے، اور اس کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی عظمت کو سمجھا جاسکے۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر:

اللہ پاک کا ارشاد ہے: "إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (آل عمران: ۱۹۰ و ۱۹۱)

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے جن کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا، ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں سو ہم کو عذاب دوزخ سے بچالیجئے"

غور و فکر کیسے کیا جائے؟

اس آیت میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں غور و فکر کرنے کا حکم ہے، اور ان میں غور و فکر اس طرح کیا جائے گا کہ یہ سب چیزیں حادث ہیں، بعد میں پیدا کی گئی ہیں، پہلے ان کا کوئی وجود نہیں تھا، اور پیدا کرنے کے بعد ان میں مستقل تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اور ان کے نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، رات اور دن، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں، مشرق اور مغرب، ان سب میں تغیرات اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اور پھر ان کے ساتھ ایک بہت بڑا اور مکمل نظام جڑا ہوا ہے، آسمان اور زمین کا، چاند اور سورج کا، گرمی اور سردی کا، رات اور دن کا، بادلوں کے برسنے کا، کھیتیوں اور بیلوں کے پیدا کرنے کا، نہروں کے بہنے کا، زمین کی موت و حیات کا، انسانوں کی پیدائش کا، توالد و تناسل کا، نر اور مادہ کا، یہ سارا ایک نظام ہے، انسان جب ان میں غور کرے گا تو اس کی عقل یہی کہے گی کہ ان سب کو پیدا کرنے والی ایک ذات ہے، بغیر کسی کے یہ خود بخود کیسے پیدا ہوسکتے ہیں؟ اور پھر پیدا ہونے کے بعد ان کو چلانے والی بھی کوئی ذات ہے، کیونکہ کسی نظام چلانے والے کے

بغیر یہ نظام کیسے چل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب کوئی منتظم نہ ہو اور کوئی مدبر نہ ہو اور نظامِ عالم چل رہا ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انسان جب اس طرح ان میں غور و فکر کرتا ہے تو اس سے اللہ کی ذات تک پہنچتا ہے، اور اللہ کے وجود کا قائل ہوتا ہے، کیونکہ انسانوں کے ہاتھ میں تو یہ نظام نہیں ہے، اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کوئی انسانوں کے علاوہ سبحان ذات ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

خدا کے ایک سے زیادہ نہ ہونے کی عقلی دلیل:

نظام کائنات میں غور و فکر کرنے سے انسان اللہ کے وجود کا تو قائل ہو جاتا ہے لیکن اس کے ایک ہونے اور اس کی وحدانیت کو سمجھنے کے لئے کچھ اور عقل کی ضرورت پڑتی ہے، اور تھوڑی عقل استعمال کرنے سے وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ یہ سارا نظام چلانے والی ایک ہی ذات ہے، اس کے ساتھ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔ قرآن پاک میں بھی اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ امور صرف ایک ہی ذات انجام دے سکتی ہے، کوئی اس میں شریک نہیں، کیونکہ اگر کئی ذاتیں اس کو چلانے والی ہوں اور اس کو انجام دینے والی ہوں تو ظاہر ہے کہ ہر ایک کے پاس قدرت ہو گی، طاقت ہو گی، اختیار ہو گا اس لئے ہر ایک یہی چاہے گا کہ میری بات مانی جائے، میرا فیصلہ نافذ کیا جائے، وہاں کمپرمائز (صلح) نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہر ایک اپنے ارادے اور منشے کے مطابق چلانا چاہے گا، اور ہر ایک یہی کہے گا کہ میں بڑا ہوں، میں قادر ہوں، اس لئے میں چلاؤں گا، جب یہ اپنا ارادہ، اپنا حکم، اپنا فیصلہ نافذ کرنا چاہے گا تو دوسرا اس کے ارادہ کو، اس کے منشے کو، اس کے حکم کو، اس کے فیصلہ کو روک پائے گا یا نہیں، اگر روک دے گا تو یہ خدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ تو عاجز ہو گیا، اور اگر دوسرا اس کو نہیں روک سکتا تو وہ عاجز ہو گیا، کیونکہ اِس کے فیصلہ کو وہ نہیں روک پایا، تو جو عاجز ہو، جو اپنی نہیں چلا سکتا، جو اپنے فیصلے نافذ نہیں کر سکتا وہ کیسے خدا ہو سکتا ہے؟ ایسے ہی دونوں میں اگر لڑائی ہو گی تو ظاہر ہے کہ ایک

غالب ہو گا اور دوسرا مغلوب ہو گا، جو مغلوب ہو گا وہ خدا نہیں ہو سکتا، اس سے پتہ چلا کہ ایک ہی ذات ہے جو ان کو چلانے والی ہے اور ان کو پیدا کرنے والی ہے، اور وہ ذات اللہ کی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا'' (الانبیاء: ۲۲)

زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ وہ کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔

کیونکہ دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہو گا اور تزاحم کی وجہ سے لازماً فساد ہوتا ہے۔ اور یہاں فساد نہیں ہو رہا ہے اس لئے خدا بھی دو یا دو سے زیادہ نہیں ہیں۔

اس طرح غور و فکر کر کے انسان اللہ کی ذات کو پہچانتا ہے، اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دیتا ہے، اس لئے اللہ نے اپنی مخلوقات میں بار بار غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے، غرض عقل حق تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اسی لئے اس پر ثواب اور عذاب رکھا گیا ہے، خاص طور پر یہ نعمت مسلمانوں کو حاصل ہے، غیر مسلموں کو نہیں، اور اس میں غور و فکر کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ واحد کو مانا جائے، اور شرک سے برأت کا اظہار کیا جائے، اب آدمی اس میں جتنا زیادہ غور و فکر کرتا ہے اتنا ہی اس کے ایمان کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، ایمان کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، اس کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک تو اس مقصد کے لئے غور و فکر کرنے کا حکم ہے۔

جزا اور سزا کے نظام میں غور و فکر:

اور دوسری چیز جس میں غور و فکر کا حکم ہے وہ جزا و سزا کا نظام ہے، مثلاً انسان اس طرح سوچے کہ میرے اعمال کچھ اچھے ہیں اور کچھ برے، اب جیسی میری زندگی گذر رہی ہے اسی طرح اللہ کے پاس چلا جاؤں گا تو کیا انجام ہو گا، کل آخرت میں اس کا کیا

نتیجہ نکلے گا؟ ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ جو نفع عاجل یعنی فوراًہوتا ہے اور جو دکھائی دیتا ہے اس کی طرف تو ہم لپکتے ہیں، اور لپک کر اسی میں محو ہو جاتے ہیں، اور دوسری چیزوں کو بھول جاتے ہیں، لیکن جو نفع فورا حاصل نہیں ہوتا، اور جو دکھائی نہیں دیتا اس سے غفلت برتتے ہیں، جب کہ یہی اصل نفع ہوتا ہے۔

نفعِ عاجل پر نظر اور انجام سے بے خبر کی مثال:

اس کی مثال بالکل اس چوہے کی طرح ہے، جو اس جال میں پھنس جاتا ہے جو اسی کے لئے تیار کی گئی ہو، اور اس کے لئے اس میں کھانے کی مرغوب کوئی چیز لگائی گئی ہو، جیسے ہی وہ اس کو دیکھتا ہے تو اس کی طرف لپکتا ہے، اور کھانے لگتا ہے، اور کھانے کے ساتھ ساتھ مزہ بھی لینے لگتا ہے، لیکن جب نکلنا چاہتا ہے تو پھنس جاتا ہے، اس کو یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کھانے کی چیز کے پیچھے جو سسٹم ہے وہ ایسا ہے کہ اگر اس کو ذرا سی بھی حرکت دی جائے تو فوراًاس کا دروازہ بند ہو جائے گا، اور وہ اندر اِس طرح پھنس جائے گا کہ چاہ کر بھی باہر نہیں نکل پائے گا، یہ کیوں ہوتا ہے اس وجہ سے کہ اس کے پاس انجام بینی نہیں ہے، وہ فوراً نفع کے پیچھے پڑ کر اپنی زندگی خطرہ میں ڈال لیتا ہے۔

ایک اور مثال:

اسی طرح ایک اور مثال سن لیں کہ مچھلی کا کانٹے یا جال کے ذریعہ شکار کیا جاتا ہے، اس میں آٹا یا اور کوئی مرغوب غذا لگائی جاتی ہے، اس کو پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا کیا ہو رہا ہے، اس کے سامنے تو بس یہی ہوتا ہے کہ یہ میری غذا ہے، اور وہ اسے آسمانی تحفہ سمجھ کر اپنے منھ میں لے لیتی ہے، لیکن اس کو یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہی چیز اس کے لئے جان لیوا ہے، اور یہی چیز اس کے حلق میں پھنسنے والی ہے، وہ تو مچھلی

ہے، اُس کے پاس غور و فکر کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہے، اس لئے وہ اپنے انجام سے بے خبری کی سزا بھگت رہی ہے، لیکن ہم مچھلی نہیں ہیں، ہم انسان ہیں، ہمیں ہر چیز میں یہ دیکھنا ہے کہ حرام ہے یا حلال ہے، جائز ہے یا ناجائز ہے، اگر ہم اسی طرح زندگی گزاریں تو ہو سکتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح پکڑے جائیں، جس طرح مچھلی پکڑلی جاتی ہے، اس لئے ایک ایک قدم ہمیں سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے، کیونکہ ہم یہاں جیسے قدم اٹھاتے ہیں ویسا ہی ہمارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اچھا عمل ہوتا ہے تو اچھا بدلہ دیا جاتا ہے، برا عمل ہوتا ہے تو برا بدلہ دیا جاتا ہے۔

اچھے اور برے ہر گز برابر نہیں ہو سکتے:

یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک اچھے اور برے نیک اور بد میں تمیز نہ کریں، اور برے انسانوں کو چھوڑ دیں۔

"أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُوْنَا سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ" (العنکبوت:۴)

کیا جو لوگ (برے) برے کام کر رہے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سے کہیں نکل بھاگیں گے ان کی یہ تجویز نہایت ہی بیہودہ ہے۔ بہت برا فیصلہ ہے جو اختیار کر رہے ہیں۔ اور جو ایمان والے اعمال صالحہ والے ہیں وہ، اور وہ جو برے اعمال والے ہیں وہ ان دونوں کو برابر کر دیں گے؟

"أَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ" (ص:۲۸)

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے برابر کر دیں گے جو دنیا میں فساد کرتے پھرتے ہیں، یا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے؟

ایسا نہیں ہوگا کہ ظالم اور مظلوم دونوں کا کوئی ریزلٹ نہ ہو، یا دونوں کا ایک ہی ریزلٹ ہو، ایک چھوٹی سی گورنمنٹ میں، ایک چھوٹی سی حکومت میں، ایک چھوٹی سی فیملی میں اتنی بات گوارا نہیں کی جاتی اور اتنا ان بیلنس (Unbalance) ہونے کو قبول نہیں کیا جاتا تو آسمان وزمین کا خالق، مالک، رب اور حاکم کیسے چھوڑ دے گا؟

"یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِرُ فَمَالَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ" (الطارق:۹و۱۰)

(اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس روز ہوگا) جس روز سب قلعی کھل جائے گی۔ یعنی سب مخفی باتیں از قبیل عقائدِ باطلہ ونیتِ فاسدہ ظاہر ہو جائیں گی اور دنیا میں جس طرح موقع پر جرم سے مکر جاتے ہیں اس کو چھپا لیتے ہیں یہ بات وہاں ممکن نہ ہوگی، پھر انسان کو نہ تو خود مدافعت کی قوت ہوگی اور نہ اسکا کوئی حمایتی ہوگا۔

"یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ" (التغابن:۹)

(اور اس دن کو یاد کرو) کہ جس دن (اللہ) تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا یہی دن ہے سود وزیاں کا۔ سود وزیاں کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا نفع اور کافروں کا نقصان اس روز عملاً ظاہر ہو جاوے گا۔

"فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ، وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ" (الزلزال:۸و۹)

سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

دائمی نفع ملحوظ رکھنا چاہیے:

کوئی چیز اس سے چھوٹے گی نہیں، کھانے میں، کمانے میں، جان میں، مال میں، شہوت میں، خواہشات میں، اُجالوں میں، اندھیروں میں، دوستوں میں، دشمنوں میں، اپنوں میں، پرایوں میں، گھر میں، اور مسجد میں کوئی چیز مس ہونے والی نہیں ہے، یہ فکر

آدمی کو کرنا ہے، اور پھر اس فکر کرنے میں ترتیب بھی قائم رکھی گئی، اور بتایا گیا کہ کس چیز کی زیادہ فکر کرنی ہے، جو چیز زیادہ نفع والی اور قائم رہنے والی ہے اس کی فکر کا حکم دیا گیا، اور جو عارضی ہے اور جس کو دوام نہیں ہے اس کے پیچھے پڑے رہنے سے اور اس کو ترجیح دینے سے منع کیا گیا ہے۔

"بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى" (الاعلیٰ:۱۶و۱۷)

تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو، حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے۔

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کا وقت:

آخرت باقی رہنے والی ہے اور کوانٹیٹی (Quantity) کے اعتبار سے بھی زیادہ ہے، اور کوالٹی (Quality) کے اعتبار سے بھی زیادہ ہے، اور وقت کے اعتبار سے بھی، اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے، اس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، انسان کی سو سالہ زندگی آخرت کے صرف ایک دن کے مقابلہ میں ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف ڈھائی منٹ کے برابر بھی نہیں ہے، صرف ایک دن میں ڈھائی منٹ کا بھی تناسب نہیں، اتنا مختصر سا دنیا کا وقت ہے، اور ہم اس ڈھائی منٹ والی زندگی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، بتائیے کہ ہم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا؟ جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کے مقابلہ میں اس مختصر سی زندگی کو ترجیح دے، جیسے اگر کسی آدمی سے یہ کہا جائے کہ آپ ڈھائی منٹ کیلئے فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھ جائیں، اس کے بعد ہم آپ کا انتظام جیل میں کر دیں گے، اور دوسری صورت یہ ہو کہ ڈھائی منٹ کیلئے آپ دھوپ میں ٹھہر جائیں، یا جیل میں چلے جائیں اس کے بعد ہمیشہ کے لئے یہ محل آپ کا ذاتی ہو جائے گا، آپ بتائیے کہ ترجیح کس کو دی جائے گی؟ کیا ڈھائی منٹ کے لئے فائیو اسٹار ہوٹل میں رہ کر کوئی ہمیشہ کے لئے جہنم میں جانا پسند کرے گا؟ نہیں! وہ تو اس کو ترجیح دے گا کہ تھوڑی دیر دھوپ برداشت کر لیں، یا جیل برداشت کر لیں اس کے بعد آرام ہی آرام ملے گا۔

آخرت کی بھلائی خالص بھلائی ہے:

یہاں پر چونکہ آدمی کے لئے بھلائی یا نفع آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اس لئے وہ اس کو ترجیح دیتا ہے، لیکن یاد رکھیں کہ یہاں کی بھلائی خالص بھلائی نہیں ہے، اور جو ہے وہ بھی بہت تھوڑی ہے، اور آخرت کی بھلائی خالص بھلائی اور خالص نفع ہے، وہاں کا مزہ خالص ہے، اور ہمیشہ کے لئے ہے، اس میں کوئی برائی، کوئی کدورت نہیں ہے۔

دنیا کے عیش میں مشقت اور تکدر ہے:

آپ دنیا کا کوئی ایسا مزہ نہیں دکھا سکتے جس میں کوئی کدورت، مشقت، اور اُلجھن نہ ہو، کوئی چیز آپ ایسی نہیں دکھا سکتے جس میں کچھ پرابلم نہ ہو، بلکہ یہاں کا حال یہ ہے کہ جتنا زیادہ آپ مزہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اتنی ہی زیادہ مشقت اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، جو غریب ہے اس کو صرف غربت کا غم ہوتا ہے، اور جو امیر ہے اس کو صرف غربت کا غم نہیں ہوتا باقی دنیا بھر کے غم اس کے ساتھ لگے ہوئے ہوتے ہیں، جو غریب ہے اس کو جنگل میں، زمین پر، فٹ پاتھ پر نیند آجاتی ہے اور جو امیر ہے اس کو گھر میں اے سی کی ٹھنڈی ہوا میں بہترین گدے پر بھی نیند نہیں آتی۔

دنیا کے عیش میں تکدر ہے مگر آخرت کے عیش میں کوئی تکدر نہیں ہے، اس میں کوئی کدورت نہیں ہے۔

جنتی سر درد اور بے ہودہ بکواس سے محفوظ رہیں گے:

”لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ“ (الواقعہ: ۱۹)

”نہ اس سے ان کو درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا“

”لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا“ (الواقعہ: ۲۵ و ۲۶)

پس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آوے گی“

وہاں کوئی بے ہودہ بات نہیں ہوگی، کوئی سر دردی نہیں ہوگی، کوئی کدورت نہیں ہوگی، نہ پہننے میں کوئی کدورت ہوگی، نہ پینے میں کوئی کدورت ہوگی، نہ عیش و عشرت میں کوئی کدورت ہوگی، نہ سوچنے میں کوئی کدورت ہوگی۔

جنتی حسد اور کینہ سے پاک ہوں گے:

نہ ایک دوسرے کے دل میں کوئی کدورت ہوگی۔

"وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُتَقَابِلِيْنَ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ" (الحجر:۴۷و۴۸)

"اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب دور کر دیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح (الفت و محبت سے) رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے۔ وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جاویں گے"

جتنے مسلمان جنت میں جائیں گے سب کے سینوں سے گندگی کو، کینہ کو، حسد کو نکال دیا جائے گا، اس دنیا میں جن میں لڑائی تھی، حسد تھا، بغض تھا، اختلاف تھا اور ناراضگی تھی وہاں جانے کے بعد یہ سب کا سب ختم کر دیا جائے گا، اور وہ سب ایک دوسرے کے سامنے تختوں اور مسندوں پر خوشی خوشی بیٹھے ہوں گے، "وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُوْنَ" (الطور:۲۵) اور ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہوں گے۔

دنیا خواہشات کی تکمیل کی جگہ نہیں:

میرے بزرگو دوستو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا میں جو انسان کو پیدا کیا ہے وہ اسی مقصد سے پیدا کیا ہے، ایک نظام کے تحت آدمی دنیا میں آتا ہے اور پھر یہاں سے چلے جاتا ہے، کسی کو اس دنیا میں ہمیشہ رہنا نہیں ہے، اور پھر یہاں آنے کے بعد کچھ

پریشانیوں کو دیکھتا ہے اور کچھ خوشیوں کو دیکھتا ہے، امیر ہے وہ بھی کبھی پریشانی اور کبھی خوشی میں ہوتا ہے، اور غریب بھی کبھی پریشانی اور کبھی خوشی میں ہوتا ہے، اِس کی بھی خواہشات ہوتی ہیں، اور اُس کی بھی خواہشات ہوتی ہیں، لیکن کسی کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ خواہشات پوری ہونے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ خواہش کرنے کی جگہ بھی نہیں ہے، اصل خواہشات کی جگہ تو جنت ہے، ایک عربی شاعر کہتا ہے:

كُلُّ مَايَتَمَنّٰى الْمَرْءُ يُدْرِكُهٗ تَجْرِى الرِّيَاحُ بِمَالَا تَشْتَهِى السُّفُنُ (دیوان متنبی:۱۳۴)

”ہر وہ چیز جس کی آدمی تمنا کرتا ہے وہ اس کو نہیں ملتی، ہوائیں اس سمت کو چلتی ہے جسے کشتیاں نہیں چاہتیں“

ارادوں کے ٹوٹنے سے رب کو پہچانیں:

یہ مزاج اور فطرت ہے، اور یہ اللہ پاک نے اس لئے رکھا ہے تاکہ انسان کو پتہ چلے کہ اس کے اوپر کسی اور کی مرضی چلتی ہے، تم جو چاہتے ہو وہ ہونا ضروری نہیں ہے، اصل مرضی میری چلتی ہے، اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد ہے:

”عَرَفْنَا اللّٰهَ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ“ (خطب الشیخ محمد الغزالی:۲/۱۵۰)

”ہم نے اپنے پروردگار کو عزائم اور ارادوں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے پہچانا“ کتنی آرزوئیں، کتنے ارادے، کتنے پلان اور کتنے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں، اور کتنا ہی بڑا کوئی مدبر ہو یا کتنی ہی بڑی کوئی آرگنائزیشن ہو جب خدا کی مرضی نہیں ہوتی ہے تو وہ چلتے نہیں ہیں، سب کے سب ختم ہو جاتے ہیں۔

اعمال میں غور و فکر:

اس لئے یہاں اس کی مرضی کے مطابق چلنے کی فکر کرنا چاہیئے، اور ڈرتے رہنا چاہیئے کہ کہیں اس کی مرضی کے خلاف کوئی عمل نہ ہو جائے، جس کی وجہ سے وہ ہمارا مؤاخذہ

کرلے، آیتِ مبارکہ میں اللہ پاک نے یہی فرمایا کہ کل کے دن کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے؟ کیا اعمال کئے ہیں؟ ذرا سوچو اور فکر کرو، اور اللہ سے ڈر کر زندگی گزارو، ولتنظر کے معنی یہی ہیں کہ ان چیزوں کا انسان دھیان رکھے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کام کاج میں ہر چیز میں اللہ کا دھیان رکھے، تاکہ کل کے دن کی کچھ تیاری ہو جائے، اور وہاں عیش و عشرت سے رہ سکے۔

کل سے کونسا کل مراد ہے؟

"کل" جو ہے وہ فیوچر (Future) یعنی مستقبل کیلئے آتا ہے آنے والے وقت کیلئے آتا ہے، اور مستقبل میں بھی کئی اعتبار سے اس کو استعمال کیا جاتا ہے، لیکن ہم کو اصل وہ کل دیکھنا ہے جو اللہ کے پاس ہوتا ہے، ایک "کل" تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کہتا ہے آج تو نوکری ہے، نعمتیں ہیں لیکن کل کا کچھ پتہ نہیں، اس "کل" سے چند دنوں کے بعد چند ہفتوں کے بعد چند مہینوں کے بعد یا چند سالوں کے بعد کا وقت مراد ہوتا ہے، بیٹے سے آپ کہتے ہیں کہ کچھ پڑھ لو تاکہ کل کچھ کام آئے، اس کل سے بیٹے کی پڑھائی کے بعد کی زندگی مراد ہوتی ہے، ایسے ہی کہتے ہیں کہ آج تم تو ہمارے ساتھ ہو لیکن کل تمہاری شادی ہو جائیگی تو کیا کروگے؟ اب شادی ایک دن کے بعد بھی ہوتی ہے، ایک ہفتہ کے بعد بھی، ایک مہینہ کے بعد بھی، ایک سال کے بعد بھی، سرکاری ملازم کہتے ہیں کہ اس وقت تو کام چل رہا ہے مجھے کل کی فکر ہے ریٹائرمنٹ کی فکر ہے، ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ہوگا نہیں معلوم، کل کل میں بہت فرق ہوتا ہے، ہر آنے والے ٹائم کو کل کہتے ہیں، لوگ اپنے اپنے اعتبار سے اس کو استعمال کرتے ہیں، اور اس کی فکر سب کو ہوتی ہے، لیکن ایک کل وہ کل ہے جس دن اللہ کے ہاں ہمارا حساب ہوگا، وہ کل کا دن بہت سخت ہے، کل سے وہی دن مراد ہے، اور "آج کل" در اصل ہمارے اعتبار سے ہے،

قرآن کی زبان میں کل وہ دن کہلاتا ہے جہاں سے انسان کی دوسری زندگی شروع ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس پوری دنیا کی زندگی آج ہے، سب حال ہی حال ہے، وہاں ماضی اور مستقبل نہیں ہے، انسانوں کے پاس یہ تین زمانے ہیں، اور یہ ترتیب اللہ نے ہمارے لئے بنائی ہے، اور اس حساب سے ہماری زندگی بالکل مختصر ہے، آخرت کے اعتبار سے دنیا کی زندگی دو تین منٹ کی ہے، اللہ پاک چاہتے ہیں کہ بندہ دو تین منٹ تھوڑی مشقت برداشت کرلے، پھر ہمیشہ کے لئے اس کو باغات مل جائیں گے، نعمتیں اس کو مل جائیں گی، لیکن ہم اسی دو تین منٹ کے پیچھے پڑ کر اور اسی کو سب کچھ سمجھ کر اپنی آخرت اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی برباد کرتے ہیں، اس لئے اللہ پاک نے فرمایا ''اِتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ'' اللہ سے ڈرو اور اس بات کا دھیان رکھو کہ کل کے لئے کیا کر رہے ہو، اور یہ بھی محض اللہ پاک کی شفقت ہے، ان کی مہربانی ہے، ہم کو بارہا یاد بھی دلاتے ہیں کہ ایک دن تم کو میرے پاس آنا ہے، اس دن کی کچھ فکر کرلو، کچھ عمل کرلو، اس لئے یہ دھیان رہے کہ میں کیا کر رہا ہوں، نماز کی پابندی کر رہا ہوں یا نہیں؟ سستی تو نہیں ہو رہی ہے؟ جو کما رہا ہوں اس کا کل کے دن پر کچھ اثر تو نہیں پڑے گا؟ جو کھا رہا ہوں اس کا کل کے دن پر کچھ اثر تو نہیں پڑے گا؟ خوشی میں، غم میں، فنکشن میں، تفریحات میں سب چیزوں میں اس کا دھیان رکھنا چاہیئے۔

اعمال کا تفصیلی محاسبہ ضروری ہے:

جب تک آدمی اپنے اعمال کا تفصیلی جائزہ نہیں لیتا اس وقت تک اس کو صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ دینی اعتبار سے اس کا حال کیا ہے؟ آدمی کی طبیعت میں یہ کمزوری ہے، وہ بہت سی چیزوں پر سرسری نظر دوڑاتا ہے، جس کی وجہ سے اولا تو اسے غلطیوں کا احساس ہی ہوتا، اور جو نیک اعمال ہوتے ہیں ان کی تھوڑی مقدار کو بھی بہت سمجھتا ہے

مثلاً آپ ذکر کرتے وقت اللہ اللہ کچھ مخصوص مقدار میں پڑھنا چاہیں، اور تسبیح کے دانوں کے بغیر اس کو پڑھتے رہیں تو پچاس مرتبہ کے بعد آپ کو ایسا لگے گا کہ میں نے بہت پڑھ لیا ہے، اگر تسبیح لے کر آپ پڑھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کتنے مرتبہ پڑھا تھا، آپ ہزار مرتبہ پڑھنا چاہ رہے تھے، بغیر تسبیح کے آپ پڑھیں گے تو دو تین منٹ کے بعد آپ سمجھیں گے ہزار تو ہوگئے، حالانکہ وہ آدھے بھی نہیں ہوتے، یہ انسان کا مزاج ہے بغیر حساب کے تھوڑے کو بھی بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تسبیح کے بغیر پڑھنے میں شیطان تسلی دیتا ہے کہ بہت پڑھ لیا، اب بس، اس لئے پہلے کے بزرگان دین تسبیح کے دانوں کے ساتھ تسبیح پڑھنے کے لئے کہتے تھے، مثلاً اگر سو دانوں کی تسبیح ہے تو کم از کم درودِ شریف کی ایک تسبیح پڑھنی چاہیے، ایک تسبیح استغفار کی پڑھنی چاہیے، چونکہ نفس شریر ہے اور اوپر سے شیطان بھی بہکاتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے تھوڑی مقدار بھی زیادہ لگنے لگتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ تسبیح لے کر پڑھنا چاہیے۔

تسبیح کے دو فائدے:

لوگ تسبیح لے کر پڑھنے میں شرماتے ہیں، جبکہ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ اس کو لے کر پڑھنے میں دو فائدے ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے ہاتھ میں رہنے سے ذکر کی یاد ہوتی رہتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کا نام مُذَکِّرَہ (یاد دلانے والی) ہے، اور دوسرے تسبیح سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ذکر کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اور کتنا پڑھا اور کتنا باقی ہے اس کی بھی تمیز ہو جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ آدمی جتنا زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی زیادہ ثواب بھی ملتا ہے۔

زکوٰۃ وصدقات کا محاسبہ کریں:

ایسے ہی صدقہ اور زکوٰۃ کا مسئلہ ہے، آدمی بغیر حساب کے کسی کو دس ڈالر دے دیا، کسی کو بیس دے دیا، کسی کو پچاس دے دیا تو سمجھتا ہے کہ میں نے بہت زکوٰۃ ادا کر دی، بہت کچھ خرچ کر دیا، بہت سے لوگ اندازہ سے زکوٰۃ نکالتے ہیں اور اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ میں نے بہت زکوٰۃ دے دی، حساب کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ بہت نہیں بلکہ واجب مقدار بھی ادا نہیں ہوئی، نفلی صدقات کا تو کیا پوچھنا، جب واجب مقدار ہی صحیح ادا نہیں ہوتی ہے تو نفلی کا کیا شمار؟ آپ جنوری سے جنوری تک کے پیسوں کا حساب کریں کہ پورے سال میں کل پیسے کتنے جمع ہوئے؟ مکان کی تعمیر میں یا کرائے میں یا مرمت وغیرہ میں کتنے خرچ ہوئے؟ پتہ چلا کہ صرف رہنے کے لئے سال بھر میں مختصر مکان کے بارہ ہزار ڈالر خرچ کئے، پھر کھانے پینے میں، دواؤں میں، انشورنس میں، خواہشات کی تکمیل میں اتنے خرچ کئے جاتے ہیں کہ بارہ ہزار ڈالر بھی اس کے سامنے کم ہو جاتے ہیں، اتنے ہزاروں ڈالر آدمی اپنے رہنے سہنے کے لئے کھانے پینے کے لئے بیوی بچوں کے لئے جائز ناجائز خواہشات کے لئے خرچ کر دیتا ہے لیکن اللہ کے راستے میں کتنا خرچ کیا، اس کا حساب بھی لگالے تو پتہ چلے گا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کئے ہوئے صرف چند سو ڈالر ہیں، اس وقت اپنے آپ پر شرم آنے لگتی ہے کہ جس ذات نے یہ سب چیزیں مجھے دی ہیں اس کے لئے تو میں نے کچھ نہیں کیا، ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سب کچھ اسی کے لئے کیا جاتا، لیکن ہوا یہ کہ اسی کو بھلا دیا گیا۔

سال میں دو مرتبہ ختمِ قرآن قرآن مجید کا حق ہے:

ایسے ہی قرآن مجید وقتاً فوقتاً پڑھ لیتے ہیں، تلاوت ہوتی رہتی ہے لیکن کتنا پڑھ رہے ہیں اس کا حساب نہیں ہوتا، کبھی پاؤ پارہ، کبھی آدھا پارہ، کبھی ایک دو رکوع، کبھی زیادہ

اور کبھی کم پڑھ لیتے ہیں اور اس کو بہت سمجھتے ہیں، اس کا بھی حساب کرکے دیکھنا چاہیئے کہ سال بھر میں کتنا قرآن پڑھا گیا، سال میں دو قرآن پاک ہوئے یا نہیں، کیونکہ سال میں دو قرآن مجید کا ختم کرنا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ضروری ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سال میں دو مرتبہ قرآن پاک مکمل پڑھنا قرآن پاک کا حق ہے، (فتح المعین بشرح قرۃ العین:۲/۲۸۸) صحیح بات تو یہ ہے کہ سال میں ایک مرتبہ ختمِ قرآن سے اس کا حق ادا ہو جاتا ہے، اور وہ قرآن کو چھوڑنے والا شمار نہیں ہوتا، ہاں مستحب یہ ہے کہ سال میں کم از کم دو مرتبہ قرآن پاک ختم کیا جائے۔ (الفتاویٰ الہندیہ:۵/۳۱۷)

اب بہت سے لوگ سال بھر قران مجید نہیں پڑھ پاتے، اور جو پڑھتے ہیں تو وہ بھی بہت کم، الاماشاء اللہ، اس سے قرآن پاک کا حق ادا نہیں ہو گا، جب قرآن کا حق ادا نہیں ہو گا تو یہی قرآن کل ہمارے خلاف حجت کر سکتا ہے، اس لئے اس کا اہتمام بھی رکھنا چاہیئے۔

ایسے ہی بہت سے لوگوں کے ساتھ درودِ شریف کا معاملہ ہے، خطیب صاحب ہر جمعہ خطبہ میں کہتے ہیں کہ دیکھو درودِ شریف کو نہ بھولنا، اور یہ آیت پڑھتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" (الاحزاب:۵۶)

"بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر، اے ایمان والو! تم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو"۔

تاکہ ہر مسلمان کو یہ یاد دلایا جائے کہ وہ سرکار پر صلوۃ وسلام مسنون طریقہ پر پڑھنا نہ بھولے، اس میں کوتاہی نہ کرے، لوگ کہتے ہیں کہ ہم چلتے پھرتے پڑھتے رہتے ہیں، بھائی! چلتے پھرتے پڑھنا کافی نہیں ہے، اگر اس کا حساب لیا جائے کہ چلتے پھرتے کتنی مقدار میں پڑھتے ہیں تو پھر اس مقدار پر شرمندگی ہو گی کہ اتنی تھوڑی مقدار میں ہم نے پڑھا۔

غرض ذکر واذکار، استغفار، تسبیحات، تلاوت، خیرات، نوافل، عبادات اور معاملات سبھی چیزوں کا محاسبہ کرنا چاہیئے، اور سبھی چیزوں میں اللہ کا اور آخرت کا دھیان رکھنا چاہیئے، چاہے وہ اعمال عبادت کے طور پر انجام دے رہے ہوں یا عادت کے طور پر کہ میرے اس عمل کا کل کے دن پر کیا اثر ہوگا، اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

بچوں کی صحیح تعلیم نہ ہونے پر بھی مؤاخذہ ہوگا:

بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بھی پوری توجہ کی ضرورت ہے، مثلاً بچہ کو آپ نے اسکول میں ڈالدیا، اور جائزہ نہیں لیا کہ وہاں کا ماحول کیسا تھا؟ دینی ماحول تھا یا بے دینی کا ماحول تھا، پردہ اور حجاب تھا یا بے حیائی، فحاشی، عریانیت تھی، لڑکوں اور لڑکیوں میں پردہ کا ماحول تھا یا نہیں، عقائد کی اس میں اصلاح ہوتی تھی یا اس کو بگاڑا جاتا تھا، شرعی حدود کی اس میں رعایت تھی یا اس کو پامال کیا جاتا تھا، بچوں کو اگر ایسے اسکولس میں ڈال دیا جائے تو اس سے پوچھا جائے گا کہ ایسا کیوں کیا؟ اور اس وقت کا حساب لیا جائے گا، اگر اس سے پوچھا جائے کہ کس حساب سے تم نے اس بچہ کو اتنے سال اسکول میں ڈال رکھا تھا تو کیا جواب دیا جائے گا؟

بچہ کی مثال خام میٹریل کی ہے:

بچہ تو خام میٹریل کی طرح ہوتا ہے، کچا مال ہوتا ہے، جس سانچے میں اس کو ڈالا جائے وہ ویسا ہی ڈھل جاتا ہے، جیسے پلاسٹک کے دانے ہوتے ہیں، برتن یا سامان بنانے سے پہلے مختلف مشینوں کے ذریعہ اس کو گزارا جاتا ہے، اور آخر میں جاکر وہ مکمل ڈبے یا کسی چیز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، ایسے ہی بچہ کا حال بھی اس دانے کی طرح ہوتا ہے، اسکول میں جب آپ نے اس کو ڈال دیا تو گویا ایک فیکٹری میں ڈال دیا، نرسری اور پھر مختلف کلاسس سے گزر کر اس میں کچھ پختگی پیدا ہوتی ہے، اور جیسا وہاں کا ماحول ہوتا

ہے بچہ اس کے مطابق ڈھل کر نکلتا ہے، بے دینی وہاں تھی تو بچہ بھی بے دین ہو کر نکلتا ہے، بد اخلاقی وہاں تھی تو بچہ بھی بد اخلاق بن کر نکلتا ہے، عقائد کا بگاڑ وہاں تھا تو اس کے بھی عقائد بگڑے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے ماں باپ سے پوچھا جائے گا کہ بے دینی کے ماحول میں بچوں کو کیوں داخل کیا؟ اس وقت ہم کیا جواب دیں گے، سوائے شرمندگی اور رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے فرمایا گیا: ''وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ'' کہ کل کیلئے کیا کر رہے ہو ذرا سوچو!

اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں:

وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔

اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے۔

اندھیروں میں، اجالوں میں، خلوتوں میں، جلوتوں میں، جان میں، مال میں، اور اولاد میں ہر چیز کی اللہ کو خبر ہے۔ ہر کام سے اللہ واقف ہیں۔

''وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ'' (الحشر:۱۸و۱۹)

''اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی، اور اللہ کو بھلا دیا سو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں''

اسلوبِ قرآنی شفقت سے بھرپور ہے:

ایک بزرگ نے بڑی عجیب بات بیان فرمائی ہے، بعض مفسرین تفسیر میں لاجواب نکات بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایمان والوں کے ساتھ غایت تعلق اور غایت شفقت کی بات ہے، یہ نہیں فرمایا: ''لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ'' یعنی ان لوگوں میں سے مت بننا جو بھول گئے اللہ کو، بلکہ فرمایا: ''لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ'' ان لوگوں کی طرح اور ان کے مشابہ مت ہونا جو اللہ کو بھول گئے، کیونکہ ایمان والا ایسا نہیں

ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کو بھلادے، گویا اللہ پاک بندوں سے فرماتے ہیں کہ مجھے تم سے یہ توقع نہیں ہے کہ تم ایسا کروگے، کیونکہ تم تو اپنے ہو، ہاں جو لوگ بھولے ہوئے ہیں ان لوگوں کی طرح مت بننا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ان کے ماحول کی وجہ سے کچھ اثر تم پر بھی ہو جائے، اور ان میں کچھ ڈھل جاؤ، اس لئے یاد رکھنا کہ ان میں ڈھل کر تم مجھ کو مت بھولنا، کیونکہ وہ میرے مقابلہ میں اوروں کو ٹھہراتے ہیں، اس لئے ان کی ذرا سی مشابہت بھی مجھے پسند نہیں ہے۔

مشابہت کی اہمیت دنیاوالوں کی نظر میں:

دنیا میں صرف مشابہت اختیار کرنے والوں کو کیسے کیسے ایوارڈ دئے جاتے ہیں! کوئی کسی کا لباس پہنتا ہے، کوئی کسی کا ڈائیلاگ کہتا ہے، کوئی کسی کی چال چلتا ہے تو اس کی نقل اور مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے اس کو اہمیت دی جاتی ہے، اس کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اسی طرح اس مشابہت کی اللہ کے ہاں بھی بہت اہمیت ہے۔

غیروں کی مشابہت پر وعید اور اس کی وجہ:

چونکہ کافرین، مشرکین اور منافقین وغیرہ یہ سب اللہ کے دشمن ہیں، اللہ کے منکر ہیں، اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے والے ہیں اس لئے ان کی مشابہت اللہ کو بالکل بھی پسند نہیں ہے، اللہ پاک دیکھتے ہیں کہ بندہ کس کی مشابہت اختیار کرتا ہے؟ میرے پیغمبروں کی یا میرے عاشقوں یا میرے اولیاء کی ہے، یا کافروں، فاسقوں اور میرے دشمنوں کی ہے، ظاہر ہے کہ جب آپ اپنے جگری دوست کے پاس اس کے دشمن کی شکل اور اس کے دشمن کی مشابہت اختیار کرکے جائیں گے تو کیا وہ آپ سے خوش ہوگا؟ اسی طرح حق تعالیٰ بھی اپنے دشمنوں کی مشابہت بلکل پسند نہیں فرماتے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابی داود: کتاب اللباس: باب فی لبس الشهرة ۴۰۳۳)

جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں سے شمار ہوتا ہے۔

اور یہ حکم صرف ظاہر میں نہیں ہے بلکہ باطن میں بھی ہے، اس لئے اللہ پاک فرماتے ہیں کہ عقائد، عبادات اور معاملات کسی بھی چیز میں ان کی مشابہت درست نہیں ہے۔ جو لوگ ان کی مشابہت اختیار کریں گے ان کا انجام بھی انہیں کے ساتھ ہوگا، آخرت میں تو ان کا انجام برا ہوگا ہی لیکن دنیا میں ان کا انجام یہ ہوگا کہ اللہ پاک خود ان کو ان کی ذاتوں سے بھلادیں گے، جس کی وجہ سے وہ اپنی کامیابی اور ناکامی سے بے خبر ہوجائیں گے، یہی حال ہمارا بھی ہوگا، پھر اس کے بعد اللہ پاک کی طرف سے ان کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ وہ فاسق ہیں، حد سے گذرنے والے ہیں، اللہ کی پکڑ میں آنے والے ہیں، وہ کون کون ہیں؟ قارون، فرعون، ہامان، شداد، ابی بن خلف، ابولہب اور ابوجہل وغیرہ ہیں، ان کا گروپ الگ بنایا جائے گا، اور مؤمنین کا گروپ الگ بنایا جائے گا، اور کہا جائے گا: "وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ" (یس:۵۹)

"اور اے مجرمو! آج (اہل ایمان سے) الگ ہوجاؤ"

اب ظاہر ہے کہ دنیا میں جو حضور ﷺ کے طریقہ کے مطابق زندگی گزارے گا وہ آخرت میں صلحاء اور اتقیاء کے گروپ میں ہوگا، اور جو گنہگار ہوگا وہ کافروں اور فاسقوں کے گروپ میں ہوگا۔

بے نمازی کا حشر قارون ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ کیوں ہوگا؟

اگر کوئی بے نمازی تھا تو قارون، ہامان، اور ابی بن خلف کے گروپ میں اس کو کھڑا کیا جائے گا، سوال یہ ہے کہ بے نمازی کو ان کے گروپ میں کیوں کھڑا کیا جائے گا؟ علماء

نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ در اصل وہ بھی اللہ کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے، اور بے نمازی میں بھی یہ غفلت پائی جاتی ہے اس لئے اس کا حشر بھی انہیں کے ساتھ ہو گا۔ فرعون بادشاہت کی وجہ سے، ہامان وزارت کی وجہ سے اور ابی بن خلف تجارت کی وجہ سے اللہ کے سامنے سر نہیں جھکا تھا اس لئے کل قیامت میں بے نمازی کو بھی انہیں کے گروپ میں کھڑا کیا جائے گا۔ اور پھر وہاں پر ٹھہرنا مختصر وقت کے لئے نہیں ہو گا بلکہ ایک لمبی مدت تک ان کو ٹھہرنا پڑے گا، کیونکہ وہاں کا ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو گا، اس اعتبار سے ان کو اتنی مدت وہاں ٹھہرنا پڑے گا، اور پھر وہاں پر ٹھہرنا بھی خود کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا۔

یہ صرف اس وجہ سے ہو گا کہ دنیا میں ان کافروں اور فاسقوں کی مشابہت اختیار کی گئی تھی، اور ان کا طریقہ اپنایا گیا تھا، اس لئے آخرت میں ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا، حق تعالیٰ ہم سب کو صحیح علم اور صحیح عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ اور صحیح معنیٰ میں آخرت کی فکر اور اس کی تیاری کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

”فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیَاةُ الدُّنْیَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ“ (آل عمران:۱۸۵)

”ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پوری پاداش تمھاری قیامت ہی کے روز ملے گی تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا، اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں مگر صرف دھوکے کا سودا ہے“

عقل مند شخص کون؟

یہ ایک آیت میں نے آپ حضرات کے سامنے پڑھی ہے، جو بار بار گوش گذار ہوتی رہتی ہے، اس کا مفہوم ہر مسلمان جانتا ہے، البتہ اس پر دھیان دینے میں عام طور پر غفلت ہوتی ہے، جب کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سے غفلت سب سے بڑی غفلت ہے، اور اس کو یاد رکھنے والا اور یاد رکھ کر اس کے مطابق زندگی گزارنے والا سب سے بڑا

عقل مند ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو عقلمند ہوتا ہے وہ اس کا خیال رکھتا ہے اور جو عقلمند نہیں ہوتا وہ اس سے غفلت کرتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ"

(سنن ترمذی: کتاب صفۃ یوم القیامۃ: باب الکیس من دان نفسہ، ۲۶۴۷)

"عقلمند شخص وہ ہے جو موت سے قبل دنیا میں ہی اپنے نفس کا محاسبہ کرلے، اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے، اور عاجز وہ شخص ہے جو اپنے نفس اور خواہشات کی اتباع کرے، اور اللہ سے امیدیں باندھنے لگے"

دنیا میں نفس کا محاسبہ قیامت میں تخفیفِ حساب کا سبب ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

حَاسِبُوْا أَنْفُسَکُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوْا وَتَزَیَّنُوْا لِلْعَرْضِ الْأَکْبَرِ وَإِنَّمَا یَخِفُّ الْحِسَابُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَلٰی مَنْ حَاسَبَ نَفْسَہٗ فِی الدُّنْیَا" (سنن ترمذی: کتاب صفۃ یوم القیامۃ: ۲۶۴۷)

اپنا محاسبہ کیا کرو قبل اس کے کہ تمہارے ساتھ محاسبہ کیا جائے، اور بڑی عزت کے لئے تم تیار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو مزین کرو، اور سنوارو، بے شک قیامت کے دن اس شخص کے حساب میں تخفیف کی جائے گی جو دنیا میں ہی اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔

محاسبہ سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے:

علماء نے لکھا ہے کہ محاسبہ سے تقوی پیدا ہوتا ہے، اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے، حضرت میمون بن مہران رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "لَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ تَقِیًّا حَتّٰی یُحَاسِبَ نَفْسَہٗ کَمَا یُحَاسِبُ شَرِیْکَہٗ مِنْ أَیْنَ مَطْعَمُہٗ وَمَلْبَسُہٗ" (سنن ترمذی: کتاب صفۃ یوم القیامۃ: باب الکیس من دان نفسہ، ۲۶۴۷)

"بندہ متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتا، جیسا کہ آدمی

اپنے شریک کا محاسبہ کرتا ہے کہ کہاں سے اس کے پاس کھانا آیا، کہاں سے اس کے پاس کپڑے آئے"

ہم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا؟

دوستو! ہماری عمر اور ہماری زندگی کی حالت مسافر کی حالت کی طرح ہے، ہم فی الحال ایک سفر میں ہیں، اگرچہ ہم کو اس سفر کا شعور نہیں ہے، جب ماں شیر خوار بچہ کے ساتھ ٹرین یا پلین یا گاڑی میں سفر کرتی ہے، تو وہ جانتی ہے کہ وہ سب سفر کر رہے ہیں، لیکن جو بچہ اپنی ماں کی گود میں ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو بہت آرام اور راحت میں سمجھتا ہے، اور اپنے آپ کو ایک جگہ ٹھہرا ہوا سمجھتا ہے، اور اس کو سفر کا کوئی احساس نہیں ہوتا، اسی طرح ہم بھی اس بے شعوری کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، اور ہم کو بھی ہمارے سفر کا احساس نہیں ہے، ہمیں پتہ نہیں ہے کہ ہماری کشتی کدھر جارہی ہے، اس کی ایک منزل ہے جس کی طرف وہ تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے، پتہ نہیں اس کا سفر کب مکمل ہو جائے، کب یہ کشتی ڈوب جائے، جیسے ہی یہ کشتی ڈوب جائے گی اس وقت ہماری منزل آجائے گی اور دوسری زندگی کا آغاز ہو جائے گا، اس کے ڈوبنے سے قبل اور اس منزل کے آنے سے قبل وہاں رہنے کی تیاری کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہی اصل ہمارا ٹھکانہ اور مقام ہے، اس کی تیاری اور وہاں آرام وراحت سے رہنے کا انتظام یہیں سے کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہاں جانے کے بعد اس کا انتظام نہیں کیا جاسکتا، اس کی کوئی شکل نہیں بن سکتی، جتنا یہاں سے لے کر جائیں گے صرف وہی کام آنے والا ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز کچھ کام نہیں آئے گی، اس کے باوجود اگر ہم اسی طرح غفلت میں پڑے رہیں، اور وہاں جانے کی کوئی فکر اور کوئی تیاری نہ کریں، تو عقل کے اعتبار سے ہم اس شیر خوار بچے سے بھی گئے گذرے ہو جائیں گے، اس لئے کہ اس کو تو عقل نہیں ہے، شعور نہیں ہے،

لیکن ہمیں اللہ نے عقلِ سلیم دی ہے، اس لئے ہم سے بڑا بے وقوف کوئی نہ ہو گا اگر ہم نے اس کی تیاری نہ کی ہو۔

ہر سانس ایک قدم ہے:

یاد رکھیں کہ ہماری زندگی کی ہر سانس ایک قدم ہے، ایک ایک ساعت ایک ایک قدم ہے، اور آہستہ آہستہ ہم اپنی اس منزل کی طرف جارہے ہیں، جیسے جیسے ایک ایک قدم ہمارا آگے بڑھ رہا ہے اور وقت گذر رہا ہے ویسے ویسے وہ منزل ہم سے قریب ہوتی جارہی ہے، اور دنیا ہم سے چھوٹتی جارہی ہے، اور بالآخر ایک دن اور ایک گھڑی وہ آئے گی جس میں ہمارا یہ سفر مکمل ہو جائے گا، اور ہماری منزل آجائے گی، اور ہم موت کی آغوش میں چلے جائیں گے، اور ہماری نئی زندگی کا آغاز ہو جائے گا، ہمیں در اصل اس منزل کی فکر کرنی ہے۔

نظر سوئے دنیا قدم سوئے مرقد:

ہمارا حال یہ ہے کہ ہماری نگاہیں اس سفر میں آگے اور مستقبل کی طرف ہونے کے بجائے پیچھے کی طرف ہیں، ہماری نگاہیں اس دنیا کی رنگ رلیوں اور اس کی چمک دمک میں مگن ہیں، ہمیں مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہے، ہم نے اپنی منزل کو پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا اور الٹا ہو کر اس کی طرف دوڑ رہے ہیں، اس صورت میں ہم کیا مستقبل کی تیاری کریں گے، کیونکہ جب اس کی طرف ہماری نظر ہی نہیں ہے تو اس کی تیاری کیسے کریں گے؟ اسی وجہ سے کسی کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے:

”نظر سوئے دنیا قدم سوئے مرقد کدھر دیکھتا ہے کدھر جارہا ہے“

”مرقد“ قبر کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ قدم تو آدمی کا قبر کی طرف ہے اور نظر آدمی کی دنیا کی طرف ہے، گاڑی کا ڈرائیور سامنے کے بجائے پیچھے کی طرف دیکھنے لگے تو

اس کا انجام کیا ہو گا سبھی جانتے ہیں، ایکسیڈنٹس ہوں گے، خود بھی پریشان ہو گا اور دوسروں کو بھی پریشان کرے گا، خود بھی مرے گا اور دوسروں کو بھی ساتھ لے کر مرے گا، ہمارا حال یہی ہے، جارہے ہیں ایک طرف اور نظر ہماری دوسری طرف ہے، تو پھر ہمارا انجام کیا ہو گا؟ سب جانتے ہیں۔

موت سے کسی کو فرار نہیں:

میرے دوستو! قرآن پاک کا اعلان ہے:

"كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" ہر ایک کو موت کا مزہ چکھنا ہے، علماء نے لکھا ہے کہ یہ دنیا کی واحد حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، کسی کتاب کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، کسی ثبوت کے دینے کی ضرورت نہیں ہے، چند دن یہاں رہنا ہے اور پھر اس کو چھوڑ کر چلے جانا ہے، ثبوت خود بخود اس کو مل جائے گا، نہیں چاہے گا تب بھی ملے گا، ہر آدمی کو اس کا یقین ہے کہ یہاں کوئی بھی مستقل قیام کیلئے نہیں آیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ پاک نے فرمایا:

"وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ" (الانبیاء:۳۴)

"اور ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا پھر اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ لوگ (دنیا میں) ہمیشہ کیلئے رہیں گے؟"

کفارِ مکہ کا طعن اور اس کا جواب:

دراصل مشرکین نے آپ علیہ السلام کے بارے میں کہا تھا کہ ان کا مسئلہ چند دن کا ہے، جب ان کا انتقال ہو جائے گا تو قصہ ختم ہو جائے گا، کوئی فکر کی بات نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ ہم نے دنیا میں اس سے پہلے کسی کے لئے ہمیشگی نہیں

رکھی، اگر آپ کی موت کے بارے میں لوگ کہہ رہے ہیں تو کہنے دیں، لیکن ذرا ان سے بھی تو پوچھیں کہ کیا وہ ہمیشہ یہاں رہنے والے ہیں؟ اگر آپ کا وصال ہو جائے تو کیا وہ اس دنیا میں ہمیشہ رہیں گے؟ یہاں کسی کا مستقل قیام نہیں ہے، سب جانے ہی کے لئے آتے ہیں، رہنے کے لئے کوئی نہیں آتا، انبیاء، اولیاء، صحابہ، اتقیاء، علماء، اقطاب اور ابدال اچھے اور برے سب آئے اور سب چلے گئے، فرعون، قارون، ہامان شداد، قومِ لوط، قومِ ثمود، قومِ شعیب، قومِ فرعون، سب آئے اور سب چلے گئے، یہاں کوئی رہنے کے لئے نہیں آیا، سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اصل زندگی تو اس کے بعد کی زندگی ہے، وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، وہاں کی نعمتیں اصلی اور ہمیشہ کی نعمتیں ہیں، اور وہاں کے عذاب اور سختیاں ہمیشہ کے لئے ہیں، در اصل اس کی فکر کرنا ہے۔ ہمارے سامنے کئی واقعات اور حالات پیش آتے رہتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں لیکن کرتے نہیں۔

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے:

حال ہی میں خود ہمارے عزیزوں میں ایسے کئی واقعات ہوئے، جن کے ہاں اموات ہو گئیں، اتنے صحت مند اور متحرک کہ ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اچانک اس طرح وہ اس دنیا کو چھوڑ دیں گے، لیکن نوشتۂ تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے؟

جب اس بزم سے اٹھ گئے دوست اکثر اور اٹھتے چلے جا رہے ہیں برابر
یہ ہر وقت پیش نظر جب ہے منظر یہاں پر ترا دل بہلتا ہے کیوں کر
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

کسی کی موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، قبل اس کے کہ ہماری موت آئے ہم اس کے

لئے کچھ تیاری کرلیں، کیونکہ تیاری کا وقت یہی ہے، عبرت حاصل کرنے کا وقت یہی ہے، اپنی زندگی کو سدھارنے کا وقت یہی ہے، کل کے دن سوائے افسوس اور حسرت کے کچھ حاصل نہ ہوگا، اگر وہی حسرت اور شرمندگی اس دنیا میں ہو تو گناہوں کی معافی اور بخشش ہوسکتی ہے، لیکن وہاں وہ کچھ کام آنے والی نہیں ہے۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چند اشعار:

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، انہوں نے اس کی اچھی منظر کشی کی ہے، اور بہت ہی عجیب اشعار لکھے ہیں، کہتے ہیں:

بہر غفلت یہ تری ہستی نہیں — دیکھ! جنت اس قدر سستی نہیں
رہ گذر دنیا ہے یہ بستی نہیں — جائے عیش و عشرت و مستی نہیں
ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے — کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے
مال و دولت کا بڑھانا ہے عبث — زائد از حاجت کمانا ہے عبث
دل کا دنیا سے لگانا ہے عبث — رہ گذر کو گھر بنانا ہے عبث
ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے — کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے
یوں نہ اپنے آپ کو بے کار رکھ — آخرت کے واسطے تیار رکھ
غیر حق سے قلب کو بے زار رکھ — موت کا ہر وقت استحضار رکھ
ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے — کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے

یہ کچھ اشعار ہیں، اصل مقصود تو یہ ہے کہ آدمی کو یہ دھیان پیدا ہوجائے کہ مجھے بھی ایک دن دنیا چھوڑ کر جانا ہے، اور اللہ کی بارگاہ میں جواب دینا ہے، اس وقت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا، اپنے آپ کو کیسے بچاؤں گا؟ اس دھیان کی وجہ سے وہ گناہوں کو چھوڑ

دے، تکبر کو دل سے نکال دے، حسد اور جلن کو دل سے نکال دے، لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ دے۔

دنیا کا قیام ریلوے اسٹیشن میں ویٹنگ روم کے قیام کی طرح ہے:

یہاں کا قیام اتنا ہے جیسے کوئی ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم (Waiting Room) میں ٹرین کا انتظار کر رہا ہو، جوں ہی اس کی گاڑی آتی ہے وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے اور اس پر سوار ہو جاتا ہے، کون بے وقوف ہو گا جو اس ویٹنگ روم کو اپنا مستقل ٹھکانہ اور رہائش گاہ سمجھے، اور وہاں رہنے کی تیاری کرنے لگے، اور گاڑی کی فکر نہ کرے، ایسی ہی ہماری زندگی کی حالت ہے، اس کی مدت اتنی تھوڑی سی ہے، ایک دن موت آئے گی اور ہماری زندگی ختم ہو جائے گی، اگر ہم اس دنیا کے پیچھے ہی پڑے رہیں، اور اپنی موت اور مستقبل کی فکر نہ کریں تو ہم سے بڑا بے وقوف کون ہو گا؟

دنیا سے دل کیسے ہٹائیں؟

اب سوال یہ ہے کہ یہاں کی چیزوں سے دل کیسے ہٹائیں؟ اور یہاں کی لذتوں اور مستیوں کو کیسے ترک کریں؟ اور اس دنیا کا پیچھا کیسے چھوڑیں؟ تو حدیث میں نبی علیہ السلام نے اس کا ایک حل بتایا ہے:

"أَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ" يَعْنِي الْمَوْتَ" (سنن ترمذی: کتاب الذکر باب ما جاء فی ذکر الموت: ۲۴۷۷)

لذتوں کو کم کرنے والی اور ان کے لطف کو کم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کرو، کیونکہ اصل لذت ہی غفلت میں ڈال دیتی ہے، اور دوسری چیزوں سے انسان کو غافل بنا دیتی ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری لذت میں کوئی چیز ڈسٹرب (Disturb) اور خلل نہ کرے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس لذت کو ڈسٹرب کرنے والی

اور اس کو ختم کرنے والی چیز کو یاد کرو، تاکہ لذت ہی حاصل نہ ہو کہ جس کی وجہ سے غفلت ہو سکے۔ دنیا میں کئی واقعات، اور کئی حوادث ہم کو اس کی یاد دلاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم اس کو بھول جاتے ہیں، ہر تھوڑے دن میں اس کا نقشہ ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ پھر بھی ہم غافل بنے رہتے ہیں، خاندان میں، پڑوس میں کسی کی موت ہو جاتی ہے، اس کے جنازے میں بھی شرکت ہوتی ہے، قبرستان بھی جاتے ہیں، اور تنہا اس میت کو قبر کے اندھیرے گڑھے میں ڈال آتے ہیں، لیکن یہ عبرت حاصل نہیں کرتے ہیں کہ کل مجھے بھی مسجد لایا جائے گا، میری بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، مجھے بھی تنہا ایک تاریک گڑھے میں ڈال دیا جائے گا، میرا بھی کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا، صرف میرے اعمال میرے ساتھ ہوں گے، بیوی، بچے، ماں، باپ بھائی، بہن، رشتہ دار سب کے سب یہیں رہ جائیں گے، منکر نکیر آئیں گے، سوال و جواب ہوں گے، برزخی زندگی شروع ہو جائے گی، پتہ نہیں میرا کیا حال ہوگا؟ جس آدمی کو یہ استحضار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی زندگی کو سدھار لیتا ہے۔

موت کو کثرت سے یاد کرنے والا شہید کا درجہ پاتا ہے:

موت کو صرف یاد کرنے کے کئی فضائل آپ علیہ السلام نے بیان فرمائے ہیں، ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی علیہ السلام سے پوچھا: یارسول اللہ! ”لَيْسَ الشَّهِيْدُ اِلَّا مَنْ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ“ شہید تو صرف وہ ہوتا ہے جو اللہ کے راستے میں قتل کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! ”اِنَّ شُهَدَاءَ اُمَّتِيْ اِذًا لَقَلِيْلٌ“

تب تو میری امت کے شہید کم ہو جائیں گے، اس کے بعد فرمایا کہ اے عائشہ!

”مَنْ قَالَ فِيْ يَوْمٍ خَمْسَةً وَّعِشْرِيْنَ مَرَّةً اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِي الْمَوْتِ وَفِيْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اَجْرَ شَهِيْدٍ“ (المعجم الاوسط: ۷۶۷۶)

جو آدمی دن میں پچیس مرتبہ موت اور مابعد الموت میں برکت کی دعا کرے، پھر اسی بستر پر مر جائے تو اللہ پاک اس کو شہید کا اجر عطا فرماتے ہیں۔

موت کو یاد کرنے کی اتنی بڑی فضیلت اور تاکید ہے کہ پچیس مرتبہ موت کو یاد کیا اور دعا کرلی تو شہید کا اجر اس کو دیا جائے گا، کیونکہ جو موت کو اتنی کثرت سے یاد کرتا ہے تو وہ گناہ کیسے کرے گا؟ اس کی زندگی تو اللہ سے ڈرتے ڈرتے گزرے گی، موت کی تیاری کے ساتھ گزرے گی۔

موت کے وقت حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی کیفیت:

اس لئے کثرت سے موت کو یاد کرنا چاہیئے، اور موت کے وقت کی سختی کو یاد کرنا چاہیئے، موت کے بعد کے احوال کو یاد کرنا چاہیئے، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ان کے صاحبزادے نے ان سے انتقال کے وقت موت کی کیفیت کو پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ”وَاللّٰہِ لَکَاَنِّیْ اَتَنَفَّسُ مِنْ سَمِّ اِبْرَۃٍ، وَکَاَنَّ غُصْنَ شَوْکٍ یُجَرُّ بِہٖ مِنْ قَدَمِیْ اِلٰی ھَامَتِیْ“ (جامع العلوم والحکم محقق: الحدیث الثامن والثلاثون، ۳۲/۴۰)

اللہ کی قسم! گویا کہ میں سانس لے رہا ہوں سوئی کے ناکہ سے، اور گویا کہ کانٹوں کی ٹہنی ہے جس کو میرے قدم سے دماغ تک کھینچا جارہا ہے۔

ذرا کوئی ایک منٹ کے لئے اپنی سانس روکے یا ایک منٹ رک رک کر سانس لے یا چھوڑے اس کے بعد اپنی حالت دیکھے، پتہ چل جائے گا کہ موت کے وقت کیا کیفیت ہوتی ہے؟

فرماتے ہیں کہ ایک حالت تو یہ تھی، اور دوسری حالت یہ ہے کہ روح نکلنے کی جو تکلیف ہوتی ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کانٹے دار ٹہنی جسم کے اندر سے یعنی قدم سے دماغ تک کھینچ کر نکالی جارہی ہو۔

موت کے وقت تکلیف کی ایک اور حکایت:

ایسے ہی ایک آدمی سے موت کی تکلیف کے بارے میں پوچھا گیا کہ تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟ وہ کہنے لگا: ”اَجِدُنِیْ کَاَنَّ السَّمَاوَاتِ مُنْطَبِقَۃٌ عَلَی الْاَرْضِ عَلَیَّ، وَاَجِدُ نَفْسِیْ کَاَنَّھَا تَخْرُجُ مِنْ ثَقَبِ اِبْرَۃٍ“ (جامع العلوم والحکم محقق: الحدیث الثامن والثلاثون، ۴۰/ ۳۲)

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا کہ آسمان زمینوں پر رکھ کر وہ زمینیں مجھ پر رکھدی گئی ہیں، اور میری جان اور میری روح سوئی کے ناکہ سے نکالی جارہی ہے۔

موت کی تکلیف حضرت کعب کی زبانی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی ایک حکایت منقول ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ موت کی کیفیت کے بارے میں کچھ بتاؤ، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”ھو مَثَلُ شَجَرَۃٍ کَثِیْرَۃِ الشَّوْکِ فِیْ جَوْفِ ابْنِ آدَمَ، فَلَیْسَ مِنْہُ عَرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ اِلَّا وَرَجُلٌ شَدِیْدُ الذِّرَاعَیْنِ، فَھُوَ یُعَالِجُھَا یَنْزِعُھَا“ (جامع العلوم والحکم محقق: الحدیث الثامن والثلاثون، ۴۰/ ۳۲)

”اے امیر المومنین! وہ ابن آدم کے پیٹ میں کانٹے دار درخت کی طرح ہوتی ہے، جسے کوئی قوت والا آدمی ہر ہڈی اور جوڑ سے کھینچ کر نکالے“

یعنی روح نکلتے وقت اتنی تکلیف ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ روح ایک کانٹے دار درخت ہے جو جسم میں سے کھینچ کر نکالا جارہا ہو، یہ سن کر حضرت عمر رونے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور موت کی تکلیف کی ایک مثال:

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے موت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے زندہ چڑیا کو آگ میں ڈال دیا گیا ہو، اور وہ مرتی بھی نہ ہو۔

بنی اسرائیل کے چند عابدوں کی حکایت:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے کچھ عابدوں نے یہ طے کیا:

لَوْ صَلَّيْنَا رَكْعَتَيْنِ فَدَعَوْنَا اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يُخْرِجُ لَنَا بَعْضَ الْأَمْوَاتِ يُخْبِرُنَا عَنِ الْمَوْتِ قَالَ: فَفَعَلُوْا فَبَيْنَا هُمْ كَذٰلِكَ إِذْ طَلَعَ رَجُلٌ رَأْسُهٗ مِنْ قَبْرٍ بَيْنَ عَيْنَيْهِ أَثَرُ السُّجُوْدِ، فَقَالَ: يَا هٰؤُلَاءِ مَا أَرَدْتُمْ إِلَيَّ فَوَاللهِ لَقَدْ مِتُّ مُنْذُ مِئَةِ سَنَةٍ فَمَا سَكَنَتْ عَنِّي حَرَارَةُ الْمَوْتِ حَتّٰى كَانَّ الْآنَ فَادْعُوا اللهَ أَنْ يُعِيدَنِيْ كَمَا كُنْتُ۔ (المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۱۱۵۶)

چلو ہم قبرستان جاتے ہیں اور وہاں نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ کسی مردہ کو ہمارے لئے قبر سے نکالے، تاکہ وہ ہم کو موت سے متعلق کچھ بتائے، چنانچہ انہوں نے اسی طرح کیا، اچانک ایک آدمی نے قبر سے اپنے سر کو نکالا جس کی آنکھوں کے درمیان سجدہ کا نشان تھا، اس نے کہا کہ تم کیا پوچھنے کیلئے آئے ہو؟ اللہ کی قسم مجھے مرے ہوئے ایک سو سال ہوگئے لیکن موت کی حرارت اور تکلیف سے مجھے ابھی اطمینان نہیں ہوا، ابھی تک وہ ختم نہیں ہوئی، آج تک موت کی تکلیف کا احساس زندہ ہے، پس تم اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے لوٹا دیں جیسا کہ میں تھا۔

موت کی سختی سے پناہ مانگیں:

اس لئے موت کی سکرات کی آسانی کیلئے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰى سَكَرَاتِ الْمَوْتِ" (سنن ترمذی: کتاب الجنائز: باب ما جاء فی التشدید عند الموت، ۹۹۴)

اے اللہ موت کی سختی میں ہماری مدد فرما۔

ایک تو موت کی تکلیف الگ ہوتی ہے، اور دوسرے ملک الموت کے آنے کا اثر الگ ہوتا ہے، جو آدمی نیک ہوتا ہے ملک الموت اس کے پاس انتہائی خوبصورت شکل میں

آتے ہیں، اور جو آدمی برا ہوتا ہے اس کے پاس انتہائی بدصورت شکل میں آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کا ملک الموت کو دیکھ کر بے ہوش ہو جانا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مرتبہ ملک الموت سے فرمایا کہ آپ کی اصلی حالت یعنی موت کے وقت جس حالت میں آپ انسانوں کے پاس جاتے ہیں وہ حالت دیکھنا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے خلیل! یہ آپ برداشت نہیں کر پائیں گے، حضرت ابراہیم نے کہا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں، تو فرشتہ نے کہا کہ اپنا چہرہ پھیر لیجیے، حضرت ابراہیم نے اپنا چہرہ پھیر لیا، پھر تھوڑی دیر بعد ملک الموت کو دیکھا تو وہ اس حال میں تھے کہ ان کا سر آسمان کو چھو رہا تھا، ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے، ان کے ہر بال پر آدمی کا ایک چہرہ تھا، جن کے منہ اور کان سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھا تو بے ہوش ہو گئے، جب افاقہ ہوا تو ملک الموت اپنی اصلی حالت پر آ گئے تھے، حضرت ابراہیم نے ان کو دیکھا تو کہا:

"لَوْ لَمْ یَلْقَ الْکَافِرُ عِنْدَ مَوْتِہٖ مِنَ الْبَلَاءِ وَالْحُزْنِ اِلَّا صُوْرَتَکَ لَکَفَاہُ"

اگر موت کے وقت کسی کافر کو کوئی بلا یا غم وغیرہ نہ پہنچے سوائے آپ کی اس صورت کے تو یہی اس کے لئے کافی ہے۔ (الدر المنثور، سورہ بقرہ، آیت: ۲۶۰، ۲/۳۳)

موت کے وقت نیک مومنین کے حالات:

جو آدمی نیک ہوتا ہے اس کے لئے ملک الموت اچھی صورت میں آتے ہیں، خوبصورت لباس اور سفید ریشم میں آتے ہیں، جس سے بہترین خوشبو مہک رہی ہوتی ہے، اور آکر بشارت دیتے ہیں، اور پہلے ہی سے اس کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ اور جب اس کو لے کر آسمانوں سے گذرتے ہیں تو فرشتے کہتے ہیں اتنی بہترین خوشبو کہاں سے آرہی ہے، اور بعض فرشتے بعض سے اس کو لینے لگتے ہیں، اور یہ خوشخبری دیتے

ہیں: ”اُخْرُجِيْ رَاضِيَةً مَرْضِيًّا عَنْكِ اِلٰى رَوْحِ اللّٰهِ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانٍ“ (سنن نسائی: ۱۸۱)

تو اپنے پروردگار کے پاس خوشی خوشی اور اس حال میں کہ تیرا رب تجھ سے خوش ہے، ناراض اور غصہ میں نہیں ہے، لوٹ جا، پھر وہ نکلتی ہے مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ عمدہ خوشبو کے ساتھ، پھر جب آسمان کے دروازے کے پاس اس کو لے کر آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہی بہترین یہ خوشبو ہے جس کو لے کر تم آئے ہو، پھر مومنین کی روحوں کے پاس اس کو لے کر آتے ہیں، اور وہ اس کو دیکھ کر اتنا زیادہ خوش ہوتے ہیں جتنا کہ تم میں سے کوئی غائب آدمی کے آنے سے خوش ہوتا ہے، پھر وہ پوچھتے ہیں فلاں نے کیا کیا؟ اور پھر فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اس کو چھوڑ دو، یہ دنیا کے غم سے نکل کر یہاں آیا ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ساتویں آسمان میں علیین میں اس کا نام لکھ دو، اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو، میں نے اس کو وہیں سے پیدا کیا، اور وہیں لوٹا دوں گا، اور دوبارہ وہیں سے اٹھاؤں گا۔ پھر قبر میں فرشتے آتے ہیں، اور یہ سوال کرتے ہیں: ”مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ: رَبِّيَ اللّٰهُ“ ”تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے“ پھر وہ پوچھتے ہیں: مَا دِيْنُكَ؟ تو وہ کہتا ہے: ”دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ“ پھر وہ پوچھتے ہیں: مَنْ هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ یہ شخص کون ہیں، جو تم میں بھیجے گئے تھے، تو وہ کہتا ہے: ”هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

امتی قبر میں آپ ﷺ کو کیسے پہچان پائیں گے؟

وہ کہتے ہیں: ”وَمَا يُدْرِيْكَ“ تجھ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ محمد ہیں: تو وہ کہتا ہے: ”قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَآمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ“ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی، اور اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی تو اس سے مجھے پتہ چلا کہ یہ محمد ﷺ ہیں۔

نیک مومنین کے لئے قبر میں جنت کا لباس اور بستر ہو گا:

اس کے بعد آسمان سے آواز آتی ہے:

"صَدَقَ عَبْدِیْ فَافْرِشُوْہُ مِنَ الْجَنَّۃِ وَاَلْبِسُوْہُ مِنَ الْجَنَّۃِ وَافْتَحُوْا لَہٗ بَابًا مِنَ الْجَنَّۃِ"

میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لئے جنت کا بستر بچھادو، جنت کا لباس پہنادو، اور اس کے لئے جنت کا دروازہ کھول دو، چنانچہ جنت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے پھر اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور حدِّ نظر تک اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے۔

نیک اعمال خوبصورت انسان کی شکل میں:

پھر اس کے بعد ایک خوبصورت انسان بہترین خوشبو لگا کر اس کے پاس آتا ہے، اور اس سے کہتا ہے: اَبْشِرْ بِالَّذِیْ یَسُرُّکَ فَھٰذَا یَوْمُکَ الَّذِیْ کُنْتُ تُوْعَدُ"

اس مبارک دن کی خوشخبری ہو جو تجھ کو خوش کر دے گا، جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا، "فیقول لہ من انت" تو مردہ کہتا ہے کہ تم کون ہو؟ تو وہ خوبصورت انسان کہتا ہے: "اَنَا عَمَلُکَ الصَّالِحُ" میں تمہارا نیک عمل ہوں، مردہ جلدی سے خوشی خوشی کہتا ہے کہ اے رب! جلدی سے قیامت قائم کر دیجئے تا کہ میں اہل و عیال سے مل لوں، ایسے نیک بندہ کے لئے قرآن مجید میں بھی اللہ پاک نے فرمایا:

"یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

"(اور جو اللہ کے فرمانبردار تھے ان کو ارشاد ہو گا کہ) اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (کہ یہ بھی نعمت

روحانی ہے) اور میری جنت میں داخل ہو جا،" جب بندہ کے ساتھ یہ حالات پیش آتے ہیں تو بتایئے کہ اس کی روح کتنی خوش ہوتی ہو گی، بس وہ سکون اور اطمینان میں ہوتا ہے۔

نیک مومن کی ملاقاتیں:

پھر جو لوگ نیک اعمال اور دعائے مغفرت کر رہے ہوتے ہیں ان کے تحائف اس تک پہنچتے ہیں، بلکہ نیک لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ دوستوں سے بھی ملاقات ہوتی ہے لیکن صرف نیک لوگوں ہی کی بروں کی نہیں۔

کافر اور گنہگاروں کے حالات:

جو بُرا آدمی ہوتا ہے اس کے ساتھ اتنی ہی تنگی ہوتی ہے، اتنے ہی خطرناک حالات ہوتے ہیں، اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے، اس کے لئے جہنم کی کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں، وہاں سے بدبودار اور گرم ہوائیں آرہی ہوتی ہیں، جہنم کی آگ بجھا دی جاتی ہے اور اعمال کے اعتبار سے سزا کا نظام جزوی طور پر نافذ کیا جاتا ہے، نماز نہ پڑھنے والوں کو روزانہ درے مارے جاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز چھوڑنے والوں کو قبر میں ہتھوڑا مارا جاتا ہے، اگر کوئی فرشتہ کسی پہاڑ پر اس کو مار دے تو وہ پورا پہاڑ ریت بن جائے۔ صرف نماز چھوڑنے کا اس کو یہ عذاب دیا جاتا ہے، تو دوسرے اعمال کا کیا ہو گا؟

فرشتے جب اس کے پاس آتے ہیں تو انتہائی بدصورت بدشکل اور غصہ کی حالت اور سیاہ صورت میں آتے ہیں، اور تا حد نظر اس کے پاس جگہ گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں، اس کے بعد ملک الموت آتے ہیں اور اس کے سر کے پاس بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں:

"اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْخَبِیْثَۃُ اُخْرُجِیْ اِلٰی سَخَطِ اللّٰہِ وَغَضَبِہٖ"

کہ اے خبیث نفس! اللہ کی ناراضگی اور غصہ کی طرف نکل جا، پھر وہ اس کی جان نکالتے ہیں، اور اس کی روح اس طریقے پر نکالی جاتی ہے:

"کَمَا یُنْتَزَعُ السَّفُّوْدُ مِنَ الصُّوْفِ الْمَبْلُوْلِ فَیَأْخُذُوْنَھَا فَیَجْعَلُوْنَھَا فِیْ تِلْکَ الْمُسُوْحِ"

جیسا کہ تر اون سے گوشت بھننے کی سیخ کو نکالا جاتا ہے، پھر وہ اس کو لے کر کالے بالوں والے کپڑے میں رکھ دیتے ہیں، جب وہ اس کی روح کو لے کر آسمان تک پہنچتے ہیں تو اس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے ہیں، اس موقع پر نبی علیہ السلام نے یہ آیت پڑھی، "لَا تُفَتَّحُ لَھُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ" (الاعراف: ۴۰)

پھر اللہ پاک فرشتوں سے کہتے ہیں: "اُکْتُبُوْا کِتَابَہٗ فِیْ سِجِّیْنٍ فِی الْاَرْضِ السَّابِعَۃِ السُّفْلٰی" اس کا نام اور اس کے نامۂ اعمال کو سجین میں جو کہ سب سے نچلی ساتویں زمین میں ہے لکھ دو، اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو، کیونکہ ہم نے اس کو وہیں سے پیدا کیا، اور اسی کی طرف لوٹائیں گے، اور پھر دوبارہ وہیں سے اس کو نکالیں گے، پھر اس کی روح کو پھینک دیا جاتا ہے، اس وقت نبی علیہ السلام نے یہ آیت پڑھی: "وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ" (شعب الایمان: فصل فی عذاب القبر)

منکر اور نکیر کی حالت:

پھر اس کی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے، منکر نکیر آتے ہیں، اور انتہائی ڈراؤنی حالت میں اپنے دانتوں سے زمین پھاڑتے ہوئے آتے ہیں: اور اپنے ہونٹوں سے زمین لپیٹ دیتے ہیں، "اَصْوَاتُھُمَا کَالرَّعْدِ الْقَاصِفِ" ان کی آواز گرج دار بجلی کی طرح ہوتی ہے۔ "وَ اَبْصَارُھُمَا کَالْبَرْقِ الْخَاطِفِ" اور ان کی آنکھیں اچکنے والے اور حملہ آور بھیڑیے یا بجلی کی طرح ہوتی ہیں، وہ اس کے پاس بیٹھ کر سوال کرتے ہیں، لیکن وہ ان کے جواب میں ہائے ہائے "لَا اَدْرِیْ" کہتا ہے، وہ غصہ میں ایک گرز مارتے ہیں تو اس کی وجہ سے ساری قبر آگ سے بھر جاتی ہے۔

کافروں کے لئے قبر میں آگ کا لباس اور بستر ہو گا:

پھر فرشتوں کو حکم ہوتا ہے:

”فَافْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَ اَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَ افْتَحُوْا لَهٗ بَابًا مِّنَ النَّارِ فَيَأْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَ سُمُوْمِهَا وَ يَضِيْقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ“

اس کے لئے آگ کا بستر بچھادو، اس کو آگ کے کپڑے پہنادو، اس کے لئے جہنم کے دورازے کھول دو، پھر جہنم کی لو اور گرمی اس کو آنے لگتی ہے، اور قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے، حتی کہ اس کی پسلیاں آپس میں گھس جاتی ہیں۔

برے اعمال کی شکل:

پھر انتہائی بری بدبو اور قبیح چہرے والا اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ خوشخبری ہو اس برے دن کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، وہ کہتا ہے کہ تم کون ہو؟ تو وہ کہتا ہے:

”اَنَا عَمَلُکَ الْخَبِيْثُ“ میں تمہارا خبیث عمل ہوں، تو وہ ہیبت سے کہنے لگتا ہے اے رب! قیامت قائم نہ کر، اے رب! قیامت قائم نہ کر۔ قَالَ الْبَيْهَقِيُّ رحمہ اللہ: هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْإِسْنَادِ“ (شعب الایمان للبیہقی: التاسع من شعب الإیمان و هو باب في أن دار المؤمنین و مأواهم الجنة: فصل فی عذاب القبر، ۳۹۵ و مسند احمد: ۱۹۰۳۸)

اس لئے میرے دوستو! ذرا ان حالات کو مد نظر رکھنا چاہیئے، اور ان کا مراقبہ کرنا چاہیئے کہ ہمیں بھی اس اندھیرے گڑھے میں جانا ہے، کتنے ہی ہنستے بولتے، ہشاش بشاش، نازونخروں میں پلے ہوئے روشن چہرے زیرِ زمین ہوگئے، ان کے جسم کو قبر کی مٹی اور کیڑوں نے کھالیا، ہڈیاں گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو گئیں، مال و دولت نے ان کا کیا ساتھ دیا؟ ان کے اعزہ واقرباء نے ان کا کیا ساتھ دیا؟ یہی حالات آدمی اپنے بارے میں سوچے کہ

یہ سب ایک دن میرے ساتھ ہو گا، لیکن میرا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہو گا سوائے میرے اعمال کے، اگر بے عمل ہو کر مر گیا تو میرا کیا حال ہو گا؟

موت کا کوئی وقت متعین نہیں ہے، کسی دن بھی موت آسکتی ہے، ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی بیماری لگی ہوئی ہے، کسی کو بی پی (BP) ہے تو کسی کو شوگر (Sugar) ہے، کسی کو بواسیر ہے تو کسی کو کڈنی پرابلم ہے، کسی کو ہاٹ پرابلم ہے تو کسی کو کچھ اور پرابلم ہے، اور آج کل اکسیڈنٹ اور بڑے بڑے حادثات تو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، اس لئے ہر آدمی کو اس کا استحضار ہونا چاہیے۔ اپنے ایمان اور اعمال کی فکر ہونی چاہئے، حق تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)